رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰)   جولائی ۱۹۶۵ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپئے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سلسلۂ تاریخ اسلام

دار المصنفین اس وقت تک مختلف علوم و فنون پر ۴۹ کتابیں شائع کر چکا ہے، ان میں ایک اہم سلسلہ تاریخ اسلام کا بھی ہے جو بہت مقبول ہے، یہ عربی مدارس کے منتہی طلبہ کی مطالعہ کی کتابوں کے علاوہ ہندو پاک کی مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نصاب میں بھی شامل ہے، اس کی چار جلدیں تفصیل ذیل شائع ہو چکی ہیں،

تاریخ اسلام حصہ اول

(عہد رسالت و خلافت راشدہ) قیمت ہر

تاریخ اسلام حصہ دوم

(بنی امیہ دمشق)

قیمت : ۱۲ ؎

تاریخ اسلام حصہ دوم

(خلافت عباسیہ کی تاریخ سفاح سے متقی باللہ تک) قیمت معہ

تاریخ اسلام حصہ چہارم

مستعصم باللہ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی تاریخ اور اس کے تمدنی کارنامے) قیمت معہ

مولفہ شاہ معین الدین احمد ندوی

"منیجر"

جلد ۹۶ ماہ ربیع الاول ۱۳۸۵ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۶۵ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

مسلم یونیورسٹی کے خلاف جو آرڈیننس نافذ کیا گیا ہے وہ طاقت کا نہایت غلط استعمال ہے، اس لیے اس کے خلاف جس قدر بھی احتجاج کیا گیا ہے وہ بالکل صحیح ہے لیکن آرڈیننس بہرحال عارضی ہے، یونیورسٹی کے مستقل نظام پر اس کا اثر نہیں پڑتا، اصل مسئلہ یہ ہے کہ آئندہ حکومت اس کے دستور میں کیا تبدیلی کرتی ہے، اس سلسلہ میں دو باتیں قابل غور ہیں، ایک یہ کہ مسلم یونیورسٹی ایک خود مختار تعلیمی ادارہ ہے، دوسرے اس حیثیت سے وہ اسلامی بھی ہے کہ اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ تعلیم کے ساتھ اسلامی تہذیب و روایات کے مطابق مسلمان طلبہ کی تربیت کی جائے جس کو موجودہ بحث میں اسلامی کردار سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو لوگ اسلام کے نام سے گھبراتے ہیں وہ اقلیتی کردار سے تعبیر کرتے ہیں، یہ کردار مسلمانوں کا مسلمہ دستوری حق ہے، اس لیے حکومت کو یونیورسٹی میں کسی ایسی تبدیلی کرنے کا اختیار نہیں ہے جس سے اس کے کردار اور خود مختاری میں فرق آئے۔

اس سلسلہ میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ اسلامی کردار سے مراد کیا ہے اور اس کے حدود کیا ہیں؟ چھاگلہ صاحب کے نزدیک جیسا کہ ان کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے، اس سے مراد اسلامی تہذیب و ثقافت کی تحقیقات ہے یعنی مسلم یونیورسٹی میں اسلامی تہذیب و ثقافت کی تحقیقات کو اہمیت دی جائے، لیکن یہ اسلامی کردار نہیں بلکہ ریسرچ یا علمی تحقیق ہے جس کو یورپ کی بہت سی یونیورسٹیاں انجام دے رہی ہیں اور انھوں نے اسلامیات پر جتنا کام کیا ہے وہاں تک پہنچنے کے لیے مسلم یونیورسٹی کو ایک مدت درکار ہوگی

اگر اسلامی کردار اسی کا نام ہے تو پھر یہ ساری یونیورسٹیاں مسلم ہیں، ان میں اور مسلم یونیورسٹی میں فرق کیا ہوا؟

اصل میں جو لوگ اسلامی کردار کے مفہوم ہی سے ناآشنا ہیں یا انکی نگاہ میں اس کی کوئی اہمیت نہیں اور وہ اس کو نام نہاد ترقی پسندی اور قومی وحدت کے انضمامی تصور کے منافی سمجھتے ہیں ان کو اسلامی کردار کی تعیین کا کوئی حق نہیں ہے، ان کو اس کا تو حق ہے کہ وہ یونیورسٹی کے لیے اسلامی کردار کی ضرورت اور اہمیت ہی سے علانیہ انکار کر دیں لیکن اتنی اخلاقی جرأت نہیں، اس لیے وہ اس کو فرقہ پرستی، رجعت اور علیحدگی پسندگی کی آڑ لے کر مسخ کرتے رہتے ہیں، اس کی تعبیر و تعیین کا حق ان ہی لوگوں کو ہے جو اسلامی کردار کو مسلمانوں کا سرچشمۂ حیات اور تعمیر ملت کی بنیاد سمجھتے ہیں،

اس کے لئے تنہا اسلام کے بعض ظاہری مظاہر مثلاً دینیات کی رسمی تعلیم، ہوسٹلوں میں نماز کا انتظام، رمضان میں ڈائننگ ہال کی نمائشی بندش، اسلامی تقریبات کا انعقاد، میلاد کے جلسے، اور اسی قبیل کی دوسری ظاہری چیزیں کافی نہیں ہیں، بلکہ اس سے وہ اسلامی روح مراد ہے جس سے مسلمان طلبہ میں دینی احساس، اسلامی شعائر کا احترام، ان کی عظمت، اور ملی غیرت و حمیت کا جذبہ بیدار رہے، یونیورسٹی کے احاطہ کے اندر اس کے کسی متوسل کو اسلامی عقائد و تصورات کی علانیہ مخالفت کی اجازت نہ دیجائے، اسلامی علوم و فنون کی تحقیقات اور دینی تعلیم کو خاص اہمیت دی جائے، یونیورسٹی کے تمام شعبوں میں خواہ تعلیمی ہوں، یا انتظامی مسلمانوں کی نمایاں اکثریت اور ان کا اقتدار ہو، انتظامی مجالس کے ارکان کی اکثریت کا انتخاب جمہوری طریقہ پر کیا جائے، حکومت کے نامزد کردہ ارکان کی تعداد کم سے کم رکھی جائے، غیر مسلم ارکان ایسے منتخب اور نامزد کیے جائیں، جو مسلمانوں کی تہذیب و روایات سے واقف اور یونیورسٹی کے ہمدرد و خیر خواہ ہوں، ایسے غیر مسلموں کی بھی کمی نہیں ہے، اس کے بغیر یونیورسٹی کا کردار قائم نہیں رہ سکتا،

یہ چیز نہ رجعت پسندی ہے اور نہ فرقہ پروری، اور نہ قومی وحدت اور سیکولرزم کے خلاف ہے، بلکہ اقلیتوں کا ایک تسلیم شدہ دستوری حق ہے، جس کو نہ حکومت سلب کر سکتی ہے، اور نہ کسی ترقی پسند کو اس کی اجازت دی جا سکتی ہے، خود ہندوستان میں ہندو یونیورسٹی ہندو کردار کا اور عیسائی مشنریوں کے بعض کالج عیسائی کردار کا نمونہ موجود ہیں، درحقیقت اُن کو ان کے کردار کے ساتھ قائم رکھنا ہی سیکولرزم اور جمہوریت ہے، مسلم یونیورسٹی اس معنی میں یقیناً سیکولر اور قومی ہے، کہ اس کے دروازے بلا تفریق مذہب وملت سب فرقوں کے لئے کھلے ہوئے ہیں، اور وہ اختلاف مذہب کی بنا پر کسی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کرتی، اور آج سے نہیں، بلکہ علی گڑھ کالج کے قیام کے زمانہ سے لے کر اب تک ہر زمانہ میں یہاں غیر مسلم طلبہ کی خاصی تعداد رہی ہے، جن میں بعض نامور لوگ بھی ہیں، لیکن اس معنی میں یقیناً مسلم ہے کہ اس کی فضا اور اس کا کردار اسلامی اور اس میں مسلمانوں کی اکثریت اور اس کا اقتدار ہونا ضروری ہے، یہی حقوق ہندو یونیورسٹی کو بھی حاصل ہیں،

اسلامی کردار کے نام سے بھڑکنے کی ضرورت نہیں، یہ چیز قومی وحدت و یکجہتی کے قطعاً منافی نہیں، علیحدگی پسندگی مسلمانوں کے قومی مزاج کے خلاف ہے، انھوں نے کبھی کسی قوم اور کسی تہذیب سے چھوت نہیں کی، جہاں گئے ملکی باشندوں میں گھل مل گئے، اور ان کی اور اپنی تہذیب کو ملا کر تہذیبی یکجہتی پیدا کرنے کی کوشش کی، خود ہندوستان میں ایک مشترک تہذیب اور مشترک زبان پیدا کی جس میں دونوں تہذیبوں کے یکساں عناصر ہیں، اور ہندوستان کی جیالی ذہنیت سے پہلے یہ زبان اور یہ تہذیب ہندو مسلمانوں کے بڑے طبقہ کی مشترک تہذیب و زبان سمجھی جاتی تھی، مختلف ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہندوستان کو جو ہمیشہ ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتے تھے متحدہ ملک بنایا، قومی وحدت کا تصور پیدا کیا، اس سے پہلے ہندوستان مختلف طبقوں"

فرقوں میں بٹا ہوا تھا، اور اُن میں باہم اتنا ہی بغض و عناد تھا، جتنا دشمنوں میں ہو سکتا ہے، اس لئے ہندوستان کی وحدت اور قومی یکجہتی کے سچے معمار مسلمان ہی ہیں۔ اور علیحدگی پسندی کے وہ لوگ مجرم ہیں، جو وحدت کے اُن آثار کو مٹانے کے درپے ہیں۔

آزاد مشرب ترقی پسندوں بلکہ تخریب پسندوں کا ایک طبقہ عرصہ سے مسلم یونیورسٹی کے روایات اور خصوصیات کو مٹانے کی کوشش میں مصروف ہے، لیکن وائس چانسلر صاحب ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، جو پشتہا پشت سے اسلامی تہذیب و روایات کا حامل رہا ہے، اور وہ خود اسی تہذیب کے پروردہ ہیں، ان سے بڑھ کر ان کا واقف کار اور کون ہو سکتا ہے، اس لئے ان سے توقع یہی ہے کہ وہ مسلم یونیورسٹی کی خصوصیات کو قائم رکھنے کی کوشش کریں گے، اُن کے سامنے اُن کے پیشرو بدرالدین طیب جی کی مثال موجود ہے، جن کو اسلامی تہذیب و روایات سے اتنا گہرا تعلق نہ تھا، جتنا موجودہ وائس چانسلر صاحب کو ہے، اس لئے ان پر اُن سے زیادہ اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

ابھی حال میں معلوم ہوا ہے کہ پاکستان کے ایک صاحب احسان بی اے نے سیرۃ النبی کی پہلی اور دوسری جلد کا خلاصہ کیا ہے، اور ادبستان لاہور نے اس کو شائع کیا ہے، پاکستان کے لوگوں کو معلوم ہوگا کہ دارالمصنفین کی دارومدار کتابوں کی تجارت پر ہے، اس کو نہ حکومت سے کوئی مستقل ملتی ہے اور نہ اُس نے کبھی چندہ کیا، اب اگر ارض پاک والوں نے اس کی تجارتی آمدنی پر بھی قبضہ کر لیا، تو وہ کس طرح چل سکتا ہے، اُن کا فرض تو یہ تھا کہ وہ اس کی مشکلات میں مدد کرتے، نہ کہ اُلٹے وہ اس کے ذریعہ آمدنی پر قبضہ کرکے اس کو تباہ کرنا چاہتے ہیں، جو پاکستان کے لئے انتہائی شرم و غیرت

کی بات ہے بعض اور کتابیں بھی پاکستانی ناشروں نے چھاپ لی ہیں، مگر وہ چنداں اہم نہ تھیں، اس لئے ہم نے خاموشی سے کام لیا، لیکن سیرۃ النبی دارالمصنفین کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اس کو کسی صورت میں بھی چھاپنا اس کو نقصان پہونچانا ہے، اس سے پہلے بھی ایک ناشر نے سیرۃ النبی جلد اول شائع کی تھی، اس وقت سردار عبد الرب نشتر مرحوم زندہ تھے انھوں نے دباؤ ڈال کر اس کی اشاعت رکوا دی تھی، پاکستان کے اخبارات نے بھی اس ناشر کو آڑے ہاتھوں لے لیا تھا، اس لئے اس نے مجبور ہو کر طباعت کے مصارف لے کر کتابیں دارالمصنفین کے حوالے کر دی تھیں، ہم یہاں سے بیٹھکر کیا کر سکتے ہیں، یہ فرض پاکستانی اخبارات کا ہے کہ وہ خود غرض ناشروں کو ایسا سبق دیں کہ آئندہ کوئی اس قسم کی جرأت نہ کر سکے، نوائے وقت اور چٹان سے ہم کو خاص طور سے اسکی توقع ہے،

ہمارے رفیق سید صباح الدین عبد الرحمٰن کی دو کتابوں پر اس سے پہلے یوپی گورنمنٹ سے انعام مل چکا ہے، اس سال بھی اُن کی کتاب "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں تمدنی جلوے" پر انعام ملا ہے، اس سال انشاء اللہ چھ نئی کتابیں شائع کرنے کا ارادہ ہے، دین رحمت، محدثین اسلام، تبع تابعین جلد دوم، صاحب مثنوی، مقالات سلیمانی جلد اول، عہد مغلیہ ہندوستانی مورخین کی نظر میں، دارالمصنفین کی جوبلی کی روداد کے لئے شائقین کا بڑا تقاضہ ہے، اس کی مختصر روداد معارف میں لکھی جا چکی ہے، تفصیلی روداد بھی انشاء اللہ جلد شائع کرنے کی کوشش کیجارہی ہے،

مقالات

انسانی عظمت و شرف
اور
مردِ مومن کی ذمہ داریاں

از
شاہ معین الدین احمد ندوی

انسانی عظمت و شرف اسلام سے پہلے انسانیت کا تصور بہت پست تھا، انسان پیدائشی گنہگار اور اپنے اعمال کے لحاظ سے ادنیٰ ترین مخلوق سمجھا جاتا تھا، وہ ہر طاقت کے سامنے سربسجود ہو جاتا تھا، اور ہر ادنیٰ اعلیٰ کا غلام تھا، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے انسان کا درجہ تمام مخلوق میں بلند کیا اور اسکو اشرف المخلوقات قرار دیا، وہ خالقِ عالم کی صناعی کا شاہکار ہے، خدا نے اس کو حسین ترین خلقت عطا فرمائی۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (تین) — اور ہم نے انسان کو بہترین ساخت میں پیدا کیا

حدیثوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی شکل میں پیدا کیا،

خلق اللہ آدم علی صورتہ (بخاری کتاب الاستیذان) — خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا

اس کو پیدائشی طور پر بے داغ ہر نقش سے پاک اور دینِ فطرت پر قرار دیا، پیدائش کے بعد احول

اور سوسائٹی اس پر اچھے برے نقش و نگار بناتی ہے۔

ان الانسان یولد علی الفطرۃ	انسان دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے پر اسکے
فابواہ یھودانہ او ینصرانہ	والدین اسکو یہودی یا نصرانی بناتے ہیں

حسن ظاہری کے ساتھ جمال معنوی یعنی علم و ادراک اور عقل و دانش کی دولت عطا فرمائی،

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (علق)	انسان کو وہ باتیں سکھائیں جنکو وہ نہیں جانتا تھا،
عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (بقرہ)	اور خدا نے آدم کو سارے اسماء (حقائق اشیاء) سکھائے۔

اس کو خیر و شر کی تمیز عطا فرمائی۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا	اور قسم انسان کی اور اس ذات کی جس نے
وَتَقْوٰهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا	اس کو درست بنایا پھر اس کو بدکاری اور نیکوکاری
وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا	کی باتیں سمجھائیں جس نے اپنی روح کو پاک کیا؟
(شمس)	کامیاب ہوا اور جس نے اسکو دبایا وہ گھاٹے میں رہا
وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (بلد)	اور ہم نے اسکو (نیکی اور بدی) دونوں کے راستے دکھائے۔

اعلیٰ درجہ کی عقلی و ذہنی قوتوں سے آراستہ کیا، چنانچہ کلام مجید میں بکثرت انسانی عقل سے خطاب کیا گیا ہے، اور اس کو کائنات پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ (افلا یتدبرون۔ افلا یتفکرون اور افلا یعقلون اتنی آیتوں میں آیا ہے کہ انکا شمار مشکل ہے،

اس کو ساری مخلوق پر فضیلت عطا کی گئی

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ	اور ہم نے بنی آدم کو بزرگی اور برتری عطا فرمائی
فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ	اور اس کو دریا اور خشکی میں سوار کیا اور پاکیزہ
الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى	چیزیں اس کو کھانے کو دیں اور اس کو بہت سی

كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (بنی اسرائیل) مخلوق پر فضیلت عطا فرمائی۔

اس کے سر پر خلافت اور نیابت الٰہی کا تاج رکھا، وہ مسجود ملائکہ قرار پایا اور اس کی عظمت سے انکار پر ابلیس ہمیشہ کے لیے مردود قرار دیا گیا،

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّيْ
جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيْفَةً قَالُوْٓا
أَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا
وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ
بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ
إِنِّيْٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ٥ وَعَلَّمَ
اٰدَمَ الْأَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ
عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ أَنْۢبِئُوْنِيْ
بِأَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ
قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ
إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيْمُ
الْحَكِيْمُ۔ قَالَ يٰٓاٰدَمُ أَنْۢبِئْهُمْ
بِأَسْمَآئِهِمْ، فَلَمَّآ أَنْۢبَأَهُمْ بِأَسْمَآئِهِمْ
قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَّكُمْ إِنِّيْٓ أَعْلَمُ
غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ
مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ

اور جب تمھارے پروردگار نے فرشتوں سے
کہا کہ میں نے زمین میں اپنا نائب بنانے والا
ہوں تو فرشتوں نے کہا کیا تو ایسے شخص
کو نائب بناتا ہے جو اس میں فساد پھیلائے
اور خونریزی کرے اور ہم تیری حمد و ثنا
کے ساتھ تیری تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں
خدا نے کہا میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے
اور آدم کو سب چیزوں کے نام بتائے،
پھر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش
کرکے فرمایا کہ اگر تم اپنے قول میں سچے ہو تو
ان چیزوں کے نام بتاؤ، فرشتے بولے تیری
ذات پاک ہے جو تو نے ہم کو بتایا ہے
اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے بیشک
تو ہی جاننے والا اور مصلحت کا پہچاننے والا
ہے، تب خدا نے فرمایا اے آدم تم فرشتوں
کو ان چیزوں کے نام بتاؤ پھر جب آدم نے

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (بقرہ ۴)

فرشتوں کو ان کے نام بتائے تو خدا نے فرشتوں سے فرمایا کیا ہم نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمان و زمین کی سب مخفی چیزیں ہم کو معلوم ہیں، اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو وہ سب ہم کو معلوم ہے اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کے سامنے جھکو تو شیطان کے سوا سب جھک پڑے، اس نے نہ مانا اور غرور میں آگیا اور نافرمان بن گیا۔

اقبال نے تخلیق آدم کے واقعہ سے انسانی عظمت کے بڑے لطیف پہلو پیدا کیے ہیں لکھتے ہیں:

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

خبرے رفت زگردوں بہ شبستان ازل
حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد

فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور
خودگرے خودشکنے خودنگرے پیدا شد

آرزو بے خبر از خویش بہ آغوش حیات
چشم وا کرد و جہانے دگرے پیدا شد

زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبد دیرینہ درے پیدا شد

اس سے بڑھ کر انسانی عظمت تصور میں نہیں آسکتی، اس سے پہلے انسان بدترین قسم کی غلامی میں مبتلا تھا، وہ چاند، سورج، سمندر، پہاڑ، شجر و حجر بلکہ ادنیٰ ادنیٰ جانوروں تک کی پوجا کرتا تھا، اسلام نے بتایا کہ یہ چیزیں اس کی پرستش کے لیے نہیں بلکہ اس کی خدمت اور انتفاع کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (بقرہ ۵)

زمین میں جو کچھ ہے سب خدا نے تمہارے لیے بنایا،

پوری کائنات کو اس کے لیے مسخر کر دیا۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ (حج)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ روئے زمین میں جو کچھ ہے سب کو تمہارے لیے مسخر کر دیا۔

حتیٰ کہ آفتاب و ماہتاب بھی جس کی انسان پوجا کرتا ہے، اس کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ (نحل)

اور خدا نے رات اور دن، چاند اور سورج کو تمہارے کام میں لگا دیا اور ستارے اسکے حکم سے کام میں لگے ہوئے ہیں۔

اقبال نے اس کو بڑے مؤثر اور دلکش انداز میں نظم کیا ہے

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کیلئے — جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کیلئے

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں — یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں

یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں — تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں

آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

اسلام سے پہلے مادی طاقت و قوت، دولت و وجاہت اور نسلی و قومی برتری کی پرستش ہوتی تھی، ہر کمزور طاقتور کا اور ہر ادنیٰ اعلیٰ کا غلام تھا، اسلام نے یہ سارے امتیازات ختم کر کے حسن عمل اور حسن کردار کو عزت و شرف کا معیار قرار دیا،

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ

تم میں خدا کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ پاکباز ہے۔

آزادی و مساوات کا مسئلہ جو انسانی عظمت کا ایک اہم پہلو ہے، اسلام کی نگاہ میں اس درجہ اہم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں جو آخری خطبہ دیا تھا، اس میں انسانی مساوات

پر بھی زور دیا تھا، آپ کے الفاظ یہ ہیں:

ایها الناس ان ربکم واحد	لوگو! تمھارا پروردگار ایک ہے تمھارا باپ بھی
وان اباکم واحد کلکم لآدم وآدم	ایک ہے، تم سب اولاد آدم ہو اور آدم
من تراب ان اکرمکم عند الله	مٹی سے بنے تھے، اللہ کے نزدیک تم میں
اتقاکم ولیس لعربی علی عجمی	سب سے معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ پاکباز ہے،
فضل الا بالتقوی	کسی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں مگر تقویٰ کی بنا پر۔

ایک دوسری روایت ہے جس میں تصریح کے ساتھ نسل و قومیت اور حسب و نسب پر فخر و غرور کو مٹایا گیا ہے،

ان الله اذهب عنکم عبیة	اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کے غرور اور آباو
الجاهلیة وفخرها بالآباء	اجداد پر فخر کو ختم کر دیا، انسان یا مومن
انما هو مومن تقی او فاجر شقی	پاکباز ہے یا بدکار شقی، تم سب اولاد
الناس کلکم بنو آدم وآدم	آدم ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔
خلق من تراب (ابوداؤد)	

یہ اعلان، آزادی و مساوات کا وہ چارٹر ہے جس نے انسانوں کو انسانی غلامی سے آزاد کر کے امراء و ملوک، نسل و قومیت، حسب و نسب، دولت و وجاہت اور ادنیٰ و اعلیٰ کے امتیازات مٹا کر سارے انسانوں کو ایک سطح پر کھڑا کر دیا اور کوئی انسان کسی انسان کا بندہ و غلام باقی نہیں رہ گیا۔

عظمت و شرف کی ذمہ داریاں لیکن اس عظمت و شرف کے ساتھ اس کی ذمہ داریاں بھی بڑی کٹھن ہیں، یہ فطری قانون ہے جس پر ساری دنیا کا عمل ہے کہ منصب جس قدر جلیل ہوتا ہے اسی قدر اس کی

ذمہ داریاں بھی عظیم اور پابندیاں بھی سخت ہوتی ہیں، صاحب منصب کی ذاتی حیثیت بہت کم باقی رہتی ہے۔ اس کے اعمال و افعال اور زبان تک پر پابندی عائد ہوجاتی ہے، وہ محض اپنے عہدے اور منصب کے فرائض کا نقیب اور ترجمان بنجاتا ہے۔ اس کے خلاف ایک لفظ اپنی زبان سے نہیں نکال سکتا، چنانچہ دنیاوی حکومتوں کے سربراہ، وزراء اور سفراء وغیرہ بھی صرف اپنی حکومت کے ترجمان ہوتے ہیں، ان کی ہدایات اور پالیسی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔

مرد مومن کا مقام اور اس کے فرائض | اسی طرح ایک مومن[1] جو خلیفۃ اللہ فی الارض اور دنیا میں احکام الٰہی کا مبلغ اور ترجمان ہے، خود مختار نہیں، بلکہ احکام خداوندی کا پابند ہے، اس کے خلاف ایک قدم

[1] انسانی عظمت و شرف میں پیدائشی طور پر سارے انسان برابر ہیں، اور خلیفۃ اللہ فی الارض بننے کی صلاحیت تمام انسانوں میں مشترک ہے لیکن اس کا وعدہ انہی انسانوں کیلئے ہے جنھوں نے اپنے ایمان و عمل سے انسانی شرف و عظمت کو قائم رکھا ہے اور اپنے کردار سے خلیفۃ اللہ فی الارض کے مستحق ہونے کا ثبوت دیا ہے، چنانچہ کلام مجید میں ارشاد ہے

انَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُوْنَ	میرے نیک بندے زمین کی بادشاہت کے وارث
وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ	ہوں گے تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ	نیک عمل بھی کرتے رہے، ان کو روئے زمین کی
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ	خلافت ضرور عطا کرے گا۔

یہی وہ مرد مومن ہے جس کو دنیا میں سربلندی کی بشارت دی گئی ہے۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا اَنْتُمُ	اور عارضی حالات سے تم ہمت نہ ہارو اور غمزدہ
الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ	نہ ہو اگر تم سچے مومن ہو تو تمہارا بول بالا ہوگا۔

غیر مومن اور بدکار خدا کا باغی ہے، وہ کس طرح نیابت الٰہی کا فرض انجام دے سکتا ہے، اس لیے وہ اس منصب کا اہل نہیں۔

نہیں اٹھا سکتا، اسلام کے معنی ہی اپنے کو مکمل طور پر خدا کے حوالے کر دینے کے ہیں، اس کی بڑی اچھی تمثیل حدیثوں میں ہے کہ "دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے"۔ اس حدیث کے مختلف معنی بیان کیے جاتے ہیں، لیکن سب سے دلنشین معنی یہ ہیں کہ قید کی زندگی میں انسان کو اپنے افعال کا مختار نہیں بلکہ دوسرے کا پابند ہو کر رہنا پڑتا ہے، اور ایک مومن اپنے ہر عمل میں احکام الٰہی کا پابند ہے، اس لیے دنیا گویا اس کے لیے قید خانہ ہے، اس کے مقابلہ میں جنت میں کوئی پابندی نہ ہوگی، ہر شخص اپنے عمل میں خود مختار ہوگا، اور کافر بھی احکام الٰہی کا پابند نہیں ہوتا، بلکہ اپنے افعال و اعمال میں آزاد ہوتا ہے، اس لیے دنیا اس کے لیے جنت ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت ایک مومن نہ صرف خود احکام الٰہی کا پابند ہے، بلکہ وہ دنیا میں اس کا مبلغ بنا کر بھیجا گیا ہے، وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی عظیم ذمہ داری سے گرانبار ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	لوگوں کی رہنمائی کے لیے جس قدر امتیں
تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ	پیدا کی گئیں ان میں تم سب سے بہتر ہو کہ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ	اچھے کام کرنے کا حکم دیتے ہو اور برے
(آل عمران)	کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو،

ایک دوسری آیت میں ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى	اور تم میں ایک جماعت ایسی رہنی چاہیے
الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	جو لوگوں کو نیک کاموں کی طرف بلائیں،
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ	اچھی باتوں کا حکم دیں اور بری باتوں سے
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ	منع کریں۔

حدیثوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی یہاں تک تاکید ہے۔

والذی نفسی بیدہ لتامرن	اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے
بالمعروف ولتنهون عن المنكر	تم لوگ اچھے کام کرنے کا حکم دیتے رہو اور برے
او ليوشكن الله ان يبعث عليكم	کاموں سے روکتے رہو، ورنہ خدا اپنا عذاب
عذابا من عنده ثم تدعوا	تم پر نازل کرے گا، اور پھر تم دعا کروگے
ولا يستجاب لكم (ترمذی)	اور تمھاری دعا قبول نہ کی جائے گی

ایک دوسری روایت میں ہے

قال من رای منکم منکرا فلیغیرہ	تم میں سے جو شخص کوئی بری بات دیکھے تو اس کو
بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ	چاہیے کہ اپنی قوت سے مٹائے، اگر اسکی
فان لم یستطع فبقلبہ وذلک	طاقت نہ ہو تو زبان سے لیکر مٹائے، اگر
اضعف الایمان (مسلم)	اسکی طاقت بھی نہ ہو تو کم سے کم دل سے
	اسکو برا سمجھے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے

نیکی اور خیر کی تبلیغ اور اس کے قیام و نفاذ اور بدی اور شر کے انسداد پر دنیا کا سارا نظام قائم ہے، اس کے بغیر سارا کارخانہ عالم درہم برہم ہو جائے گا، انبیاء علیہم السلام بھی اسی کی تبلیغ اور قیام کے لیے مبعوث ہوئے تھے، اور دنیاوی حکومتوں کے قوانین کا مقصد و منشا بھی درحقیقت خیر کا قیام اور شر کا انسداد ہے، ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ دنیاوی قانون کا دائرہ انسانوں کے مادی معاملات تک محدود ہوتا ہے، ان کو انسانوں کے اخلاقی اور روحانی معاملات سے صرف اسی حد تک علاقہ رہتا ہے جس حد تک عوام کے نفع و نقصان سے ان کا تعلق ہوتا ہے، لیکن احکام الٰہی اور حکومت الٰہیہ کا دائرہ انسانوں کے دینی و دنیاوی اور مادی و روحانی جملہ ضروریات تک وسیع ہے، اس لیے خلیفۃ اللہ فی الارض کی ذمہ داریاں دنیاوی حکومتوں سے زیادہ اہم ہیں۔

وہ انسانوں کے جملہ معاملات میں خواہ وہ دینی ہوں یا دنیاوی، اخلاقی ہوں یا روحانی، احکام الٰہی کا ترجمان و مبلغ بھی ہے، اور اس کے قیام و نفاذ کا بھی ذمہ دار ہے، اس اعتبار سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر مومن کا فریضہ ہے۔

اس راہ کے شدائد | درحقیقت یہی وہ بار امانت ہے جس کے اٹھانے کی ہمت زمین و آسمان نہ کر سکے اور انسان کی ہمت مردانہ نے ان کو اٹھا لیا۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ	اور ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین
وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ	اور پہاڑوں پر پیش کی تو سب اس بار امانت
أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا	کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے
وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ إِنَّهُ كَانَ	اور انسان نے اس کو اٹھا لیا، بیشک
ظَلُومًا جَهُولًا (احزاب-۹)	اپنے حق میں بڑا ظالم اور نادان ہے۔

ع آغاز کا دیوانہ انجام سے غافل تھا

کہ اس بار امانت کے اٹھانے کے معنی خدا کی راہ میں جان و مال کی بازی لگا دینے کے ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ	اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور
أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ	ان کا مال خرید لیا ہے کہ اس کے بدلے میں
لَهُمُ الْجَنَّةَ (توبہ)	ان کو جنت ملے گی۔

اس راہ میں طرح طرح کے شدائد سے آزمائش ہوتی ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ	اور ہم تم کو تھوڑے سے خوف سے اور
وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ	بھوک سے اور جان و مال اور پیداوار کی
وَالثَّمَرَاتِ (بقرہ ۱۹)	کمی سے آزمائیں گے۔

چنانچہ بڑے بڑے اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کو ایسی سخت آزمائشوں سے گذرنا پڑا کہ وہ بھی بعض اوقات تقاضائے بشری سے گھبرا اٹھے، مسلمانوں کو مخاطب کرکے ارشاد ہوتا ہے۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ	کیا تم ایسا خیال کرتے ہو کہ بس جنت میں
وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُم	داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ تم کو ان لوگوں کے
مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ	جیسے حالات نہیں پیش آئے جو تم سے پہلے
وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ	گذر چکے ہیں کہ ان کو سختیاں بھی پہنچیں اور
وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ	تکلیفیں بھی پہنچیں اور جھڑجھڑائے بھی گئے
أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ	یہاں تک کہ پیغمبر اور جو ایمان والے ان کے
	ساتھ تھے پکار اٹھے کہ خدا کی مدد کب آئیگی
	(اور ہم نے ان کو تسلی دی) کہ بس خدا کی
(بقرہ - ۲۶)	مدد قریب آگئی،

اس کے نتائج | خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور دوسرے ارباب عزیمت مومنوں کو کیسے کیسے صبر آزما حالات سے گذرنا پڑا مگر ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی، ان کی قربانیوں اور جانبازیوں نے خفتۂ انسانیت کو بیدار، مری ہوئی قوموں کو زندہ اور گم کردہ راہ قافلوں کو راہ راست پر لگا دیا، اور ایک ایسی امت پیدا کر دی جو اپنے اعمال و اخلاق میں دنیا کے لیے نمونہ تھی، اور خدا کا یہ وعدہ پورا ہو کر رہا،

"میرے نیک بندے زمین کی بادشاہت کے وارث ہوں گے تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل بھی کرتے رہے ان کو روئے زمین کی خلافت (حکومت) ضرور عطا کرے گا جس طرح ان لوگوں کو خلافت دی جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں۔

اور مسلمانوں کو روئے زمین کی سب سے زیادہ وسیع اور طاقتور سلطنت عطا کی گئی جس کا ایک سرا سندھ تھا اور دوسرا فرانس کی سرحد سے ملتا تھا، اس زمانہ میں انھوں نے اقوام عالم کی قیادت اور رہنمائی کی اور ان کے ذریعے دنیا میں دین و ایمان، علم و عرفان اور اخلاق و روحانیت، اور تہذیب و ثقافت کی روشنی پھیلی، وہ جس صحرا میں نکل گئے اس کو گلشن بنا دیا، دوسری قومیں ان کے علوم اور تہذیب فخریہ سیکھتیں اور اختیار کرتی تھیں، مگر یہ اسی وقت تک تھا جب تک وہ پیغام الٰہی کے علمبردار رہے، اور اعلاء کلمۃ اللہ ان کا شعار رہا، جب سے اس کا سررشتہ ان کے ہاتھ سے چھوٹا، اس وقت سے وہ خود ان قوموں کی غلامی میں مبتلا ہو گئے جن کے وہ حاکم و رہنما اور مربی و معلم تھے، اور آج تک ان کی ذہنی غلامی میں مبتلا اور افراد سے لیکر جماعتیں اور حکومتیں تک مغربی تہذیب کے سحر میں گرفتار اور اس کے نقش قدم پر گامزن ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خدا کی خوشنودی اور نصرت نے بھی ان سے منہ پھیر لیا اور وہ اس قوت سے محروم ہو گئے جس پر ان کی توانائی کا دار و مدار تھا۔

مسلمانوں کا زوال اور اس کے اسباب آج دنیا میں مسلمانوں کی تعداد پچاس ساٹھ کروڑ کے درمیان ہے، اور ان کی بیس پچیس حکومتیں ہیں، اس کے باوجود ان کی کوئی آواز نہیں، اور وہ ایک پس ماندہ قوم بنکر رہ گئے ہیں، ان کی حکومتوں تک میں کوئی جان باقی نہیں ہے، چنانچہ پوری عرب دنیا ملکر بھی اسلام اور مسلمانوں کی سب سے بڑی دشمن اسرائیل کی چھوٹی سی ریاست کا مقابلہ نہیں کر سکتی، ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ سے اوپر ہے، لیکن ان کی کوئی حیثیت نہیں، اس لیے کہ وہ زندگی کی اس قوت سے محروم ہیں جس کے بغیر انسانوں کی حیثیت جانوروں کے گلے اور خس و خاشاک سے زیادہ نہیں، جس کو ایک معمولی چنگاری جلا کر خاکستر کر سکتی ہے،

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے　　　مسلماں نہیں خاک کا ڈھیر ہے

ایک مغالطہ کا ازالہ مغربی قوموں کی تقلید اور اس کے فوائد کی سب سے بڑی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ وہ مذہبی قیود سے آزادی اور مادی نظام حیات ہی کی بدولت بام عروج پر پہنچی ہیں، اگر مذہب ترقی میں مانع نہ ہوتا تو مسلمان جو مغربی قوموں کے مقابلہ میں زیادہ مذہبی ہیں، کیوں پستی اور تنزل کا شکار ہوتے، لیکن یہ سراسر مغالطہ ہے، نہ مغربی قوموں نے محض مذہبی آزادی اور مادی تصور حیات کے بدولت ترقی کی اور نہ مسلمان مذہب کی پابندی سے تنزل میں مبتلا ہیں، اولاً یہی قابل بحث ہے کہ جس مادی ترقی کو دلیل میں پیش کیا جاتا ہے کیا وہ واقعی انسانیت کی صحیح اور متوازن ترقی ہے، اور اس سے انسانیت کی ضروریات اور اس کے مطالبات پورے ہو جاتے ہیں، اور کیا واقعی مسلمان مذہب کے پابند ہیں؟

مغربی قوموں کی ترقی کے حقیقی اسباب مغربی قوموں کی ترقی کا سبب محض مذہب سے آزادی اور مادی تصور حیات نہیں، بلکہ قوموں کی موت وحیات اور ترقی و تنزل کے اصولوں پر ان کا عمل ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے بھی کچھ اصول مقرر کیے ہیں، جو قوم بھی ان پر عمل کرے گی وہ ضرور دنیا میں سربلندی حاصل کریگی، خواہ وہ مومن ہو یا کافر اور جو قوم ان کو چھوڑے گی خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو تنزل کا شکار ہوگی، فطرت کے قوانین سب کے لیے یکساں ہیں، ان میں مومن و کافر کی تخصیص نہیں، جس طرح صحت اور تندرستی کے کچھ اصول و قوانین ہیں، جو بھی ان کی پابندی کرے گا وہ بیماری سے محفوظ اور تندرست رہے گا، اور جو خلاف ورزی کرے گا وہ امراض کا شکار ہوگا اور ہلاکت تک نوبت پہنچ جائے گی، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک کافر صحت کے اصولوں کی پابندی کے باوجود محض اپنے کفر کی بنا پر تندرست نہ رہے، اور ایک مومن ان اصولوں کی خلاف ورزی کے باوجود محض اسلام سے انتساب کی بنا پر امراض وہلاکت سے محفوظ رہے، یہی حال قوموں کی صحت اور توانائی اور بیماری اور ہلاکت کے اصولوں کا ہے،

قوموں کی موت وحیات اور ترقی وتنزل کے عناصر قوموں کی ترقی اور تنزل اور موت وحیات کے بہت سے عناصر ہیں، مثلاً نصب العین کا تعین، اس کی صحت پر ایمان اور یقین واثق، اس کے حصول کی جد وجہد، اس کے لیے جانبازی وجانفروشی، قومی وحدت، اجتماعی مفاد کے لیے ایثار و قربانی ہمدردی و مواسات وغیرہ، جن قوموں میں بھی یہ اوصاف ہوں گے وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گی، خواہ وہ مومن ہوں یا کافر، اگر اس معیار سے مسلمانوں اور مغربی قوموں کا موازنہ کیا جائے تو مسلمان ان کے مقابلہ میں ہیچ نظر آئیں گے، مغربی قومیں اپنے بعض اخلاقی عیوب اور مادی تصورِ حیات کے باوجود ان اصولوں پر سختی سے عامل ہیں، انھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین، مادی ترقی، سیاسی سربلندی اور دنیاوی عیش وتنعم کو بنالیا ہے، اور اس کے لیے ان کو مال کیا جان تک دے دینے میں باک نہیں ہوتا، یورپ کے بڑے بڑے فضلاء اور سائنٹسٹ اس راہ میں اپنی جانیں قربان کر چکے ہیں، جب قومی اور اجتماعی مفاد کا سوال آتا ہے تو ہر فرد اپنا پورا خاندان قومی مفاد کے لیے لٹا دیتا ہے، سلاطین اور امراء اپنے لڑکوں کو بلا تامل میدان جنگ میں بھیجتے ہیں، وہ مادی ترقی اور محدود قومی مفاد کے لیے جتنی قربانیاں کرتے ہیں، آج کے مسلمان اپنے دین وملت کے لیے اتنی قربانی نہیں کر سکتے، انھوں نے اپنی زندگی کے لیے جو اصول بنا لیے ہیں ان پر سختی سے ان کا عمل ہے، اور ان کی پابندی ان کی فطرت میں داخل ہوگئی ہے، اس لیے ان کی ترقی کا سبب مذہب سے آزادی نہیں بلکہ مادی اور قومی ترقی کے اصولوں پر ان کا عمل ہے، اور یہ بھی کلیۃً صحیح نہیں ہے کہ وہ مذہب سے مطلق آزاد ہیں، اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

محض مادی ترقی انسانیت کی ترقی نہیں ہے لیکن یہ ترقی درحقیقت انسانیت کی نہیں بلکہ صرف مادی ترقی ہے، جس سے انسانیت کے مطالبات پورے نہیں ہوتے، انسانوں کو صرف مادی سروسامان ہی کی احتیاج نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ اس کو اخلاق، روحانیت کی بھی ضرورت ہے۔

اس کے بغیر محض مادی طاقت انسان کو حیوان بنا دیتی ہے، جو طاقت بھی اخلاق اور انسانیت کے اصولوں کی پابند نہ ہوگی وہ انسانیت کے لیے وبال جان بنجائے گی، اسی لیے آج مغربی قوموں کی ساری طاقتیں اور علم و سائنس کی تمام ترقیاں انسانوں کے لیے سکون و راحت کا سامان فراہم کرنے سے زیادہ اس کی ہلاکت اور تباہی و بربادی کے سامان فراہم کرنے میں صرف ہو رہی ہیں، ان میں اقتدار اور سیاسی برتری کی ایک جنگ برپا ہے، ایسے ایسے اسلحے ایجاد ہو رہے ہیں کہ اگر ان کے استعمال کی نوبت آگئی تو عالم انسانیت کا خاتمہ یقینی ہے، اس ہلاکت آفرینی کو دیکھکر خود یورپ کے بڑے بڑے مفکرین مضطرب ہیں اور انسانیت کے نام پر اخلاق و روحانیت اور عالمگیر انسانی اخوت و ہمدردی کی صدا بلند کر رہے ہیں،

اگر انسان نے فلک شگاف راکٹ ایجاد کر لیے، چاند پر پہنچکر اپنا جھنڈا گاڑ دیا بلکہ اس سے بھی اونچا اڑا تو اس سے مادی طاقت کے اظہار کے سوا کیا حاصل ہوا، انسانیت کی ترقی اور اس کی صحیح خدمت تو یہ ہوتی کہ اس ترقی کے ساتھ قوموں میں خدا شناسی، اخلاق فاضلہ اور انسانی ہمدردی و مواسات پیدا کیجاتی، اس کے بغیر محض مادی طاقت ایک شتر بے مہار اور مست ہاتھی ہے جو انسانیت کو کچل کر رکھ دیگی اس لیے یہ ترقی درحقیقت انسانیت ترقی نہیں بلکہ صرف مہلک مادیت کی ترقی ہے۔

کیا مسلمان مذہب کے پابند ہیں اب دوسرے سوال کو لیجئے، کیا واقعی مسلمان مذہب کے پابند ہیں، اور انکی مذہبیت ہی ان کے تنزل و پستی کا سبب ہے، اس میں شبہہ نہیں کہ مسلمانوں میں دوسری قوموں کے مقابلہ میں مذہب کے ظاہری رسوم کی پابندی زیادہ ہے، لیکن وہ مذہب کی اصل روح یعنی اخلاص، خشیت الٰہی، رجوع الی اللہ اور اعلاء کلمۃ اللہ اور اس کے لیے ایثار و قربانی کے جذبہ سے خالی ہیں اور ان کی مذہبیت مذہب کا محض ظاہری خول ہے، اس لیے اس سے وہ نتائج کیسے نکل سکتے ہیں، جن کا خدا نے وعدہ کیا ہے، اور وہ اخلاق فاضلہ کیسے پیدا ہو سکتے ہیں جو دنیاوی سربلندی کے لیے

ضروری ہیں۔

مسلمانوں نے مذہب کے ایک اہم پہلو یعنی قوموں کے عروج و زوال اور موت و حیات کے اصولوں کو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے، اسلام محض روزہ، نماز، حج اور زکوٰۃ کا نام نہیں ہے، اور اس کے بھی کتنے مسلمان پابند ہیں، بلکہ اعلاء کلمۃ اللہ اور اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی اور شوکت و عظمت کے لیے جد و جہد ایثار و قربانی، انفاق فی سبیل اللہ، قومی وحدت، اسلامی اخوت اور اس قبیل کے دوسرے اصولوں کو بالکل فراموش کر دیا ہے، جو عبادات ہی کی طرح ضروری ہیں اور جن پر قوموں کی موت و حیات کا دار و مدار ہے، بلکہ جہاد یعنی اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لیے ہر قسم کی جانی و مالی قربانی افضل العبادات ہیں، اس جد و جہد میں سائنسی علوم کی تحصیل، ان کی ایجادات و اختراعات، مضبوط نظام حکومت، فوجی قوت وہ تمام چیزیں داخل ہیں جو موجودہ دور میں کسی قوم کی بقا و استحکام کے لیے ضروری ہیں۔

خود قرآن مجید اس پر شاہد ہے، اور خلفائے راشدین کا اس پر عمل رہا ہے، علم و فن کا درجہ اسلام میں بہت بلند ہے، کلام مجید کی جو پہلی وحی نازل ہوئی وہ علم کی عظمت کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔

اسلام میں علم و سائنس کی اہمیت اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ

اپنے پروردگار کا نام لیکر پڑھو جس نے مخلوقات کو پیدا کیا، آدمی کو گوشت کے لوتھڑے سے بنایا، قرآن پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ علم سکھایا اور وہ باتیں سکھائیں جو وہ نہیں جانتا تھا۔

عالم اور غیر عالم برابر نہیں ہیں۔

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (زمر)

کیا جو لوگ جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے وہ دونوں برابر ہیں (ایسا نہیں ہے)

بلکہ علماء اور اصحاب علم کا درجہ بلند ہے

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (مجادلہ)	تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنکو علم دیا گیا ہے اللہ انکے درجے کو بلند کرے گا۔

علم ہی کی ایک قسم حکمت ہے اور حکمت کو قرآن مجید میں خیر کثیر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (بقرہ)	اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے حکمت دیتا ہے اور جس کو حکمت دی گئی اس نے بڑی دولت پائی۔

حکمت کے جو معنی بھی لیے جائیں اس میں علم و تجربہ اور عقل و دانش کی باتیں ضرور داخل ہونگی۔

دینی نقطۂ نظر سے دنیاوی علوم کی ضرورت اس قسم کی اور بھی آیات ہیں جن سے علم و حکمت کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے، عام طور پر علم و حکمت سے مراد وحی الٰہی، علم دین اور دین کی سمجھ لیجاتی ہے لیکن اس تخصیص کی کوئی وجہ نہیں جب کہ اس کے الفاظ میں عموم ہے، یہ بلا شبہ صحیح ہے کہ سب سے مقدم دینی علوم اور تفقہ فی الدین ہے، اور ان کو دوسرے تمام علوم پر اولیت اور فضیلت حاصل ہے، لیکن دوسرے علوم خصوصاً ان علوم کو خارج کر دینے کی کوئی وجہ نہیں جو دین کی خدمت اور اسلام اور مسلمانوں کی شوکت و عظمت کے قیام کے لیے اس زمانہ میں ضروری ہیں، اور جن کے بغیر کوئی قوم طاقتور نہیں ہو سکتی بلکہ زندہ نہیں رہ سکتی، خود قرآن مجید کی آیات اس پر شاہد ہیں کہ دنیاوی علوم نہ صرف دنیاوی طاقت کے حصول کے لیے ضروری بلکہ عرفان حق کے لیے بھی مفید ہیں، مثلاً کلام مجید میں جابجا کائنات کی تخلیق، اس کے مظاہر، آسمان و زمین، چاند، سورج، پہاڑ اور سمندر، بارش اور ہوا، زمین کی روئیدگی اور انسان کی خلقت پر غور و فکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ایک مومن کے عرفان کے لیے تو ان کی خلقت اور اس کے ظاہری فوائد ہی کافی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا کمال، اس کی صناعیاں اور اس کے اسرار و حکم ایک محقق اور سائنسٹ پر زیادہ منکشف ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک ظاہر بین کے لیے انسان کا ظاہری

حسن و جمال اللہ تعالیٰ کے کمال تخلیق کے ثبوت کے لیے کافی ہے لیکن تشریح الاعضاء کے ماہر ڈاکٹروں کو انسانی جسم کے ہر عضو میں اللہ تعالیٰ کی بے نظیر صناعی کی ایک پوری کائنات نظر آتی ہے، اسی طریقہ سے آسمان کی رفعت، سیاروں کی گردش، آفتاب کی حرارت اور روشنی، چاند کی ٹھنڈی چاندنی کو ایک عامی بھی دیکھتا اور خدا کی قدرت کو محسوس کرتا ہے، لیکن ایک ہیئت داں کو خلا کی لامحدود وسعتوں، سیاروں کے عظیم الشان نظام اور محیر العقول عجائبات میں خدا کی حقیقی عظمت اور اس کا جلال نظر آتا ہے اور اس کا دل پکار اٹھتا ہے کہ "رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ"۔ امام غزالی کا مقولہ ہے کہ جو شخص ہیئت سے واقف نہیں وہ معرفت الٰہی میں عنین ہے، اس لیے سائنسی علوم عرفان حق کے لیے بھی مفید ہیں۔

خلافت ارضی کے لیے مادی طاقت ضروری ہے اس مسئلہ کو ایک دوسرے پہلو سے بھی دیکھیے، حکومت اور دنیاوی اقتدار کے لیے خود قرآن مجید نے علم کی طاقت اور مادی قوت کو ضروری قرار دیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد جب بنی اسرائیل نے اس وقت کے موجود پیغمبر سے کسی کو بادشاہ بنانے کی درخواست کی تو انھوں نے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا، بنی اسرائیل نے عذر کیا کہ ان کے پاس مال و دولت نہیں ہے، وہ ہم پر کس طرح حکومت کر سکتے ہیں، ہم ان کے مقابلہ میں حکومت کے زیادہ اہل ہیں، پیغمبر نے طالوت کے استحقاق حکومت کی یہ دلیل دی

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ	اللہ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر کیا اور
بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ	انکو علم اور جسم میں زیادہ وسعت عطا کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حکومت و اقتدار کے لیے علم کی قوت اور جسمانی یا مادی طاقت ضروری ہے، اسی طرح مسلمانوں کو اپنے دشمنوں کے مقابلہ کے لیے حکم دیا گیا۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ (انفال)

اپنے دشمنوں کے مقابلہ کے لیے جتنی قوت اور پلے ہوئے گھوڑے جمع کر سکتے ہو، ان سے پوری طرح تیار رہو تاکہ انکے ذریعہ اللہ کے اور اپنے دشمنوں اور ان کے علاوہ دوسروں پر اپنی دھاک بٹھا سکو

یہ آیات اس کا ثبوت ہیں کہ اُس زمانہ میں حکومت کے استحکام اور دشمنوں کے مقابلہ کے لیے جس قسم کی طاقت کی ضرورت تھی اس کی تیاری کا حکم دیا گیا تھا، اور اس زمانہ میں جس قسم کی طاقت کی ضرورت ہے، اس کے لیے بھی وہی حکم ہے، اور اس میں علم و سائنس کی ایجادات، فوجی قوت اور ہر قسم کے جدید اسلحہ سب داخل ہیں، اور ان کے لیے مغربی علوم خصوصاً سائنس کی تحصیل اور اس میں کمال پیدا کرنا ضروری ہے

مسلمانوں کی علم دوستی اور خدمت علم مسلمانوں کی تاریخ شاہد ہے کہ انھوں نے اپنے دور عروج میں دوسری قوموں کے علوم سے پورا استفادہ کیا، ان کو ترقی دی، سیکڑوں نئے علوم ایجاد کیے، اور علمی میدان میں پوری دنیا کی امامت کی، اگر اس زمانہ میں انھوں نے علم کا پایہ نہ سنبھالا ہوتا تو بہت سے پرانے علوم جن پر موجودہ علمی ترقی کی بنیاد قائم ہے، مٹ گئے ہوتے، اور آج دنیا علم کی روشنی سے محروم رہتی، انہی نے مغربی قوموں کو یونانی علوم سے آشنا کیا، طب، فلسفہ، ہیئت، ریاضیات وغیرہ میں مسلمانوں کی تصانیف کے لاطینی تراجم صدیوں تک یورپ کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل رہے، یورپ کی نشاۃ ثانیہ انہی کی رہین منت ہے، انہی علوم کی بنیاد پر اس نے علوم و فنون کا عظیم الشان قصر تعمیر کیا، اس لیے مفید علوم کی تحصیل اور ان کی خدمت و اشاعت خواہ وہ کسی قوم کے ہوں مسلمانوں کا خاص ورثہ رہا ہے، جدید علوم خصوصاً سائنسی فنون کی تحصیل نہ صرف مسلمانوں کی دنیاوی ترقی

اور سیاسی استحکام کے لیے ضروری ہیں، بلکہ ان کے بغیر اس زمانہ میں دین کی پوری خدمت بھی نہیں ہو سکتی، لیکن اس بارہ میں نقطۂ نظر بدلنے کی ضرورت ہے، علم و سائنس کی قوت کے لیے اخلاقی حدود کی پابندی ضروری ہے، اس کا مقصد انسانیت کی فلاح و سعادت ہونا چاہیے۔ محض مادی طاقت کا حصول، سیاسی اقتدار، قومی افتخار اور سربلندی اور سامان تعیش کی فراہمی نہیں اگر سائنسی علوم کو صحیح مقصد کے لیے استعمال کیا جائے تو وہ سراسر خیر ہیں، ورنہ سراپا شر، مولانا روم آج سے صدیوں پہلے کہہ گئے

علم را بر تن زنی مارے بود علم را بر دل زنی یارے بود

اور اس کے لیے سب سے مقدم شرط خدا شناسی، خشیت الٰہی اور مواخذہ کا خوف ہے، اس کے بغیر یہ دیو قابو میں نہیں آسکتا۔

مغربی قوموں اور مغربی تہذیب کی خوبیاں مغربی قومیں اور ان کی تہذیب محض برائیوں کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ اس میں قابل تقلید خوبیاں بھی ہیں، ان کی مادہ پرستی کے باوجود ان میں مذہب کا بھی اثر باقی ہے، چرچ اور مشنری کا پورا نظام قائم ہے، جس پر حکومتیں کروروں روپئے صرف کرتی ہیں، مذہب کی تبلیغ، اخلاقی و روحانی تعلیم و تربیت اور رفاہ عام کے کاموں اور انسانوں کی خدمت کے سیکڑوں ادارے قائم ہیں، عیسائی مبلغین اخلاق و انسانیت کا پیکر ہوتے ہیں، اور انسانی ہمدردی اور انسانیت کی خدمت میں کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہت سی چیزوں میں مذہب کی روح اور اس کے مقصد پر ہم سے زیادہ انکا عمل ہے، ان کی دوسری نمایاں خوبی ان کی اصول پرستی اور ان کا ضبط و نظم ہے جو ان کی سرشت میں داخل ہے، سیاست کو چھوڑ کر جس میں وہ چنگیز و ہلاکو بنجاتے ہیں، عام زندگی میں اخلاقی اوصاف میں ان کا قدم مسلمانوں سے بہت آگے ہے۔

مغربی تہذیب کی سب سے بڑی خرابی لیکن ان کی تہذیب کی سب سے بڑی خرابی جس نے ان کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیا ہے، ان کا مادی تصور حیات ہے، اس کی بنیاد تمام تر مادیت اور لادینیت پر ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کا اثر ہر شعبۂ زندگی میں نمایاں ہے، ایک طرف مذہب کا پورا نظام قائم ہے، دوسری طرف مادی ترقی اور عیش و تنعم مقصد زندگی بن گیا ہے، اور مغرب کی تمام قومیں عیش و تنعم کی سرمستی میں اور حکومتیں مادی ترقی، سیاسی اقتدار اور قومی برتری کے جنون میں مبتلا ہیں، سیاست میں دین و اخلاق کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہ گئی ہے، اور عیش پرستی حد سے گذر کر بدمستی تک پہنچ گئی ہے، اس کے نتائج سے خود یورپ کا سنجیدہ طبقہ اور بڑے بڑے مفکرین جن میں اخلاقی احساس باقی ہے، مضطرب ہیں اور اس کے خلاف آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔

مسلمانوں نے صرف انکی برائیوں کی تقلید کی مسلمانوں نے مغربی تہذیب کی تقلید بھی کی تو انکی برائیوں میں، مغربی قوموں کے اچھے اوصاف اور کمالات میں ان کی تقلید کی توفیق ان کو بہت کم ہوئی، زیادہ تر ان کے عیوب اور ان کی برائیاں ان کے حصہ میں آئیں، اس لیے وہ ان دنیاوی فوائد سے بھی محروم رہے جو مغربی قوموں کے اوصاف کا نتیجہ ہیں۔ اس طرح دین بھی ان کے ہاتھ سے گیا اور دنیا بھی ان کو حاصل نہ ہوئی۔ مسلمانوں کے اپنے عقائد و تصورات ہیں، اپنا نظام حیات ہے اپنی تہذیب و روایات ہیں، ان کی زندگی کا خاص نصب العین اور مقصد حیات ہے، اس کے مطالبات اور ذمہ داریاں ہیں، اگر وہ ان سب کو چھوڑ کر مغربی تہذیب کے سانچے میں ڈھل کر مادی ترقی کے اوج کمال پر بھی پہنچ گئے تو وہ خیر امت کہاں باقی رہے، جن کو نیابت الٰہی اور اقوام عالم کی ہدایت و رہنمائی کا منصب سپرد کیا گیا تھا، اس کے بجائے وہ خود انہی کی برائیوں میں مبتلا ہو کر دوسری مادہ پرست قوموں کی طرح ایک قوم بن گئے، جن کی دنیا میں کمی نہیں ہے،

مسلمانوں کا منصب اور اس کی ذمہ داری

ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ آج پوری دنیا ہدایت الٰہی کو فراموش اور انسانیت کا اصل مقام کھو چکی ہے، ہر قوم مادیت کے سیلاب میں غرق اور مادی ترقی کے جنون میں مبتلا ہے، مسلمان بھی اسی سیلاب میں بہے چلے جارہے ہیں، حالانکہ وہ خیر امت ہیں، جن کو اقوام عالم کی ہدایت کا منصب سپرد کیا گیا تھا،

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	لوگوں کی رہنمائی کے لیے جس قدر امتیں
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ	پیدا کی گئیں ان میں تم سب سے بہتر ہو کہ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ	اچھے کام کرنے کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں
(آل عمران)	سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

وہ اس منصب کو فراموش کرکے "او خویشتن گم است کرا رہبری کند" کا مصداق بن گئے ہیں، لیکن اب بھی من حیث القوم انکی خصوصیات نہیں بدلی ہے، اور ان کی ہدایت و رہنمائی کا سرچشمہ قرآن مجید اپنی اصل شکل میں موجود ہے، اس لیے اس بجھے ہوئے خاکستر میں بھی ابھی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں، اس لیے آج بھی ان پر حق کا پیغام پہنچانے کی سب سے زیادہ ذمہ داری ہے، اس کیلئے ضروری ہے کہ پہلے وہ اپنے عمل سے خیر امت ہونے کا ثبوت دیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ ان کے دلوں میں ایمان کی حرارت، ان کے ہاتھوں میں ہدایت الٰہی کی مشعل، ان کے اعمال و اخلاق میں اسلام کی تصویر، ان کی نگاہ میں حقیقت بینی اور ان کے بازوؤں میں علم و سائنس کی طاقت ہو، اس وقت دنیا ان کی طرف توجہ کرنے اور ان کی باتیں سننے پر مجبور ہوگی، ورنہ محض کھوکھلی تعلّی سے خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گے اور ان کی داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں،

ہندوستان کے مسلمانوں کی مشکلات کا حل

ہندوستان کے مسلمانوں کو مغرب کی مادیت اور لادینیت کے علاوہ ایک بڑا خطرہ اکثریت میں ضم ہوجانے یا کم سے کم انکی تہذیب کے رنگ میں

رنگ جانے کا ہے، گو ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے، اور مسلمانوں کو بھی دستور میں وہی حقوق حاصل ہیں جو دوسری قوموں کے ہیں لیکن جمہوریت میں اقتدار ہمیشہ اکثریت کے ہاتھوں میں رہتا ہے، اور اسکی فطرت جارحانہ ہوتی ہے، ہر اکثریت اقلیت کو اپنے میں ضم یا کم سے کم اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتی ہے جس کی کوشش ہندوستان میں بھی جاری ہے، اس سے بچنے کی صرف یہی صورت ہو کہ وہ اپنے دلوں میں ایمان کی حرارت اور عمل میں اسلامی کردار پیدا کریں، ایک طرف ان کے ایمان میں اتنا رسوخ اور دین میں اس قدر صلابت ہو کہ وہ کسی ایسے اثر کو قبول نہ کریں جو انکے مذہب اور انکی تہذیب و روایات کے خلاف ہو، دوسری طرف اپنے اعمال و اخلاق سے دلوں کو تسخیر کریں، اور ہندوستان کی تعمیر میں ایسا موثر حصہ لیں کہ دوسری قومیں انکی اہمیت ماننے پر مجبور ہو جائیں۔

ہندوستان کو مسلمانوں نے محض تلوار کے ذریعہ فتح نہیں کیا تھا، ورنہ اتنی طویل مدت تک انکی حکومت قائم نہیں رہ سکتی تھی، بلکہ انھوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا اور ہندوستانیوں کے دلوں پر اپنے عدل، مساوات اور ملک کی محبت و خدمت کا سکہ جمایا اور اپنی ساری دماغی و ذہنی صلاحیتیں ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں صرف کر دیں، مختلف ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہندوستان کو جو ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے متحدہ ملک اور علم و فن، تہذیب و تمدن، ہر لحاظ سے اس صحرا کو گلشن بنا دیا، اسلام کی تازہ دم قوت نے ہندوستان کی مردہ رگوں میں ایک نئی روح پھونکی، اس کو توحید خالص سے آشنا کیا، انسانی مساوات کا سبق دیا، بوسیدہ رسوم و روایات اور اوہام و خرافات سے آزاد کر کے حقیقت شناس بنایا، اسلام کے اثر سے ہندو مذہب اور ہندو معاشرہ میں تجدید و اصلاح ہوئی، مسلمانوں نے ہندوستانی علوم سے جسقدر استفادہ کیا اس سے زیادہ انکی خدمت کی، ان کو پنڈتوں کے سینوں اور ہندوستان کی چہار دیواری سے نکال کر دنیا میں ان کا تعارف کرایا، نئے علوم سکھائے، ہر شعبۂ زندگی میں نفاست اور ایک ایسی مشترک تہذیب

پیدا کی جو اپنے حسن و لطافت اور خوبی و پاکیزگی میں مشرق کی تہذیبوں میں امتیازی درجہ رکھتی ہے،

مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ اسلام میں آج بھی رہنمائی کی طاقت ہے، اور وہ دنیا کو بہت کچھ دے سکتا ہے، ان کا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے، مگر آج اس کے وہ نتائج نہیں نکلتے جو اس سے پہلے نکل چکے ہیں، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حاملین اسلام خود اسلام کے محاسن سے تہی دامن ہو چکے ہیں، اس لیے وہ دوسروں پر کیا اثر انداز ہو سکتے ہیں، ان کے اسلاف اپنے عمل سے اسلام کی تصویر پیش کرتے تھے، اس کو دیکھ کر دوسری قومیں اس کی طرف کھنچی تھیں، اگر سلاطین تلوار سے ملک کو فتح کرتے تھے تو اپنے عدل و مساوات سے اس کو مضبوط کرتے تھے، مبلغین اسلام اور صوفیائے کرام اپنے اخلاق و کردار سے دلوں کو تسخیر کرتے تھے، مختلف اصناف کے اصحاب علم و کمال اپنے علوم و کمالات اور اپنی تخلیقی قوت اور تعمیری صلاحیتوں سے ملک کو سنوارتے تھے، اس لیے مفتوحہ قومیں ان کی قابلیت اور ضرورت ماننے پر مجبور ہو جاتی تھیں، اگر آج بھی مسلمان اس کا عملی نمونہ پیش کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کے وہی نتائج نہ نکلیں جو اس سے پہلے نکل چکے ہیں، ورنہ محض زبانی دعویٰ دوسروں کو متاثر نہیں کر سکتا۔

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ اگر مسلمانوں میں دینی صلابت و پختگی نہ ہوگی تو وہ رفتہ رفتہ اکثریت میں ضم ہو جائیں گے، اور اگر وہ ہندوستان میں اجنبی بن کر رہے، اپنے عمل و کردار سے دلوں کو مائل نہ کیا، اور ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں حصہ نہ لیا تو ملک کا اعتماد حاصل نہ کر سکیں گے اور احساس کمتری کا شکار ہو کر پسماندہ قوم بن کر رہ جائیں گے۔

ہندوستان میں فارسی کا مطالعہ اور اس کا مستقبل

از جناب ڈاکٹر سید امیر حسن صاحب عابدی، دہلی یونیورسٹی

(یہ مقالہ دار المصنفین کی گولڈن جبلی کیلئے لکھا گیا تھا)

اگرچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد عربی اور فارسی دونوں نے اس ملک میں جگہ لی، مگران زبانوں کے مصرف الگ الگ رہے ہیں۔ مذہبی تعلیم، تدریس اور دینی علوم کیلئے زیادہ تر عربی سے کام لیا گیا۔ اور ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کے ارتقا میں جن زبانوں کو سب سے زیادہ دخل ہے، ان میں سے ایک فارسی بھی ہے، جو سینکڑوں برس تک اس ملک کی سرکاری زبان رہی ہے، اور بغیر تفریق مذہب و ملت سب نے اس کو اپنایا، چنانچہ اس دور کی تاریخ کا مطالعہ بغیر فارسی ماخذوں کے ناممکن ہے، اس طویل اور صدیوں کی مدت میں فارسی زبان و ادب نے ہندوستان میں جو ترقی کی اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ایرانی محققین نے فارسی ادب کو جن تین سبکوں میں تقسیم کیا ہے، ان میں سے ایک کا نام سبک ہندی ہے۔

شعر، نثر، تاریخ، تذکرہ، انشاء، سلوک، منطق، فلسفہ، اخلاق، سیاست، طب، قصص، ترجمہ، تفسیر، جغرافیہ، قواعد، لغت، بلاغت، عروض و قافیہ، ریاضی، حدیث، کلام، فقہ، قرأت و تجوید، سفرنامہ، ملفوظات، ہیئت، مناظرہ، فتاوی، زیج، ہندسہ، کتب معادن، موسیقی، علم الحیوان، کیمیا، نجوم، رمل، جفر، شعبدہ بازی و طلسمات، ادعیہ اسمائ، تیراندازی، صید، شروع، فال، شطرنج، گنجفہ، خطاطی، تعبیر الرویا، صنعت و حرفت،

طباخی، مواعظ، نحو، کشکول، قانون و دستور العمل، فرامین، کتبہ جات، آداب حرب وغیرہ فنون میں ہندوستان میں جس قدر کتابیں اور رسالے فارسی میں لکھے گئے، ان کا شمار کرنا اور ان کی فہرست بنانا مشکل ہے، ان میں سے جو کتابیں چھپ گئی ہیں ان کا بھی احصا نہیں کیا جاسکتا، اور اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ ایران کے مقابلہ میں یہاں فارسی کتابیں زیادہ شائع ہوئی ہیں، تو غالباً غلط نہ ہوگا۔

گذشتہ زمانہ میں فارسی زبان و ادب میں جو کچھ کام انجام پایا، اس میں ہمارے تخلیقی آرٹ کو بہت زیادہ دخل ہے، اب ہندوستان میں فارسی کے مستقبل کا سوال ہے، اس میں تحقیق و انتقاد کو سب سے زیادہ جگہ ملنی چاہیے، اس دور کا آغاز علامہ شبلی سے ہوتا ہے، ان ہی جیسی ہستیوں کے لیے حافظ نے کہا ہے

برسر تربت ما چوں گذری ہمت خواہ

کہ زیارت گہ ارباب جہاں خواہد بود

اس سرزمین کو فخر ہے کہ اس نے علامہ شبلی جیسی شخصیت کو جنم دے کر صرف ہندوستان کے ادب کو دولت مند نہیں بنایا، بلکہ دوسرے ملکوں کو بھی اس نے استفادہ کا موقع دیا، فارسی کا کونسا ایسا عالم ہوگا جو اس بلند ہستی کو نظر انداز کرسکے اور اس سے واقف نہ ہو، فارسی ادبیات میں نہ صرف ہندوستان بلکہ اس سے باہر ایران، افغانستان، تاجکستان، وغیرہ کے لوگ اور یورپ کے مستشرقین تک ان کے آثار سے برابر استفادہ کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے، اور کوئی فارسی ادب پر کام کرنے والا انکی تصانیف سے مستغنی نہیں ہوسکتا، ایران میں شعر العجم کی پانچوں جلدوں کا فارسی ترجمہ شائع ہوچکا ہے سب سے پہلے چوتھی جلد شائع ہوئی اور سب سے آخر میں تیسری، اس وقت میں خود وہاں موجود تھا اور مجھے

فخر ہے کہ گو میں علامہ شبلی کی زیارت نہ کر سکا، مگر ان کی کتابوں کے مترجم سید محمد تقی فخر داعی گیلانی سے مل چکا ہوں جن کی عمر ۱۹۵۵ء میں اسی برس کے قریب تھی، فخر داعی تیسری جلد کے دیباچہ میں فرماتے ہیں: "چونکہ میں اس ترجمہ کے وقت درد کمر اور درد مفاصل میں مبتلا تھا، اس لیے اس کام میں کافی زحمت اٹھانی پڑی"۔ استاد سعید نفیسی اس جلد کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: "اس مفید اور پُرمغز کتاب کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ پہلی کتاب ہے جسے ایک دانشمند اور روشن بین انسان نے ادبیات فارسی جیسے لافانی خزانہ کے قیمتی موتیوں کے تجزیہ اور تحلیل میں لکھا ہے اور "الفضل للمتقدم" کی بنا پہ شبلی کا نام ہمیشہ باقی رہے گا۔ اس سے قبل افغانستان میں بھی شعر العجم کی جلدوں کے ترجمے ہوئے تھے، مگر یہ ترجمہ ایرانیوں کے ذوق کے موافق نہ تھا۔"

چونکہ میں بھی علامہ شبلی کے وطن کا ایک حقیر ذرہ ہوں، اس لیے مجھے اس بلند شخصیت سے جذباتی لگاؤ بھی ہے لیکن میرے جیسے انسانوں کا مطالعہ جن کا نقطۂ نظر محدود ہے، حضرت شبلی کے مرتبہ کو اچھی طرح اجاگر نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ ہمہ گیر شخصیت کے حامل تھے، اگر مختلف مذاق کے لوگ مل کر ان کا مطالعہ کریں تو شاید اس کا احاطہ کر سکیں، ہمیں چاہیے کہ علامہ شبلی کے نقش قدم پر چل کر اپنی دیرینہ روایات اور ادبیات کا گہرا مطالعہ کریں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ فارسی کی تمام مطبوعہ کتابوں اور رسالوں کی مکمل فہرست بنائی جائے اور ان میں سے اہم چیزوں کو پھر سے اڈیٹ کرکے شائع کیا جائے۔

مطبوعہ کتابوں کے علاوہ ہندوستان میں اور اس سے باہر فارسی کی بے شمار اہم قلمی کتابیں جو اب تک منظر عام پر نہ آسکیں، اور نفائس المآثر، مجمع النفائس، نظم گزیدہ، باغ معانی، گلدستۂ معانی، ریاض الشعراء، ریاض الافکار، ہمیشہ بہار، نشتر عشق،

طبقات شاہجہانی، جہانگیر نامۂ طالب آملی، پنجاکیانہ، سیر المنازل، فتحنامۂ نور جہاں بیگم، رقم نامۂ حسرت، حکایت پادشاہاں، شاہجہاں نامۂ ابن قزوینی، یحیی کاشی، عنایت خاں آشنا، ابوطالب کلیم، جلال الدین طباطبائی، قدسی مشہدی، چار چمن برہمن، جنگ اسلام خاں، آثار شاہجہانی، شش فتح کانگڑہ، تاریخ شاہ شجاع، عرفات عاشقین، خلاصۃ الاشعار، خلاصۃ الکلام، تذکرۃ الشعراء، تذکرۂ کاتب، تکملۃ الشعراء، سفینۂ عشرت، صحف ابراہیم، مخزن الغرایب، ید بیضا اور صبح صادق جیسی اہم کتابیں اور تذکرے ابھی تک چند قلمی نسخوں تک محدود ہیں جن تک عام طور سے لوگوں کی رسائی نہیں ہوتی، ضرورت ہے کہ یہ مآخذ ایڈٹ کرکے شائع کیے جائیں، تاکہ محققین تک آسانی سے پہنچ سکیں۔

ہمارے ملک میں بکثرت پبلک اور شخصی کتبخانے ہیں جن میں سے اکثر کتب خانوں کو عام طور سے لوگ نہیں جانتے اور نہ ان تک آسانی سے ان کی رسائی ہوتی ہے، مثلاً مہاراجہ بنارس کا کتب خانہ، بنارس یونیورسٹی کا سریرام گلکشن، لکھنؤ میں آغا ابو صاحب اور تقی صاحب کے کتب خانے، لکھنؤ کے ایک کتب خانہ کو گورنمنٹ سے ہر طرح کی امداد ملتی ہے، اور ابن حبیب بغدادی کی المنمق کا واحد قلمی نسخہ اسی کتب خانہ میں ہے، چونکہ نظام حیدرآباد کے یہاں سے اس خاندان کو وظیفہ ملتا تھا، اس لیے اس قلمی نسخہ کی نقل دائرۃ المعارف کو مل گئی تھی، مگر ابھی حال میں جب ایک صاحب دائرۃ المعارف کیجانب سے اس کتاب کو ایڈٹ کرنے کے سلسلہ میں لکھنؤ گئے تو کتب خانہ کے مالکوں نے ان کو اصل نسخہ سے مقابلہ کرنے کی اجازت نہیں دی، جو بڑا علمی اور اخلاقی جرم تھا، اس لیے حکومت کا فرض ہے کہ وہ ایسے اداروں کو مجبور کرے کہ وہ علمی کاموں میں رکاوٹ پیدا نہ کر سکیں۔

ایسے کتب خانے بھی ہیں جو مشہور ہیں، اور اس میں استفادہ کرنے والوں کو ہر طرح کی

سہولت ملتی ہے، مگر بدقسمتی سے ان کی فہرستیں ابھی تک نہیں چھپ سکیں، رضا لائبریری جیسے اہم کتب خانہ کی مکمل فہرست ابھی تک رامپور سے باہر دستیاب نہیں ہو سکتی۔

اس لیے ضرورت ہے کہ پہلے تمام رسمی اور غیر رسمی کتب خانوں کی مکمل فہرست تیار کیجائے، تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ ان سے روشناس ہو سکیں، پھر ان کی محققانہ فہرستیں مرتب کیجائیں تاکہ محققین غلطیوں کا شکار نہ ہوسکیں، ابھی الور میوزیم کی فہرست چھپی ہے، جس میں دیوان سرمد کا ذکر ہے لیکن درحقیقت یہ سرمد کا دیوان نہیں ہے، جب میں نے ۱۹۶۱ء میں الور میوزیم کو دیکھا تھا، اس وقت بھی وہاں کی قلمی فہرست میں یہ غلطی موجود تھی، جو مطبوعہ فہرست میں منتقل ہوگئی ہے، مجھکو وہاں ایک آدمی بھی ایسا نہ ملا جو فارسی کا کیا ذکر اردو سے بھی واقف ہو، اس لیے یہ کام بھی اہم ہے، اس قسم کے خزانوں کی نگرانی ایسے لوگوں کے سپرد کی جائے جو علمی طریقہ سے ان کی نگرانی اور خود بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہوں۔

کتب خانوں کی تنظیم کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ان تمام مخطوطات کا مطالعہ کیا جائے جو ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی تاریخ و تہذیب اور آثار قدیمہ کے مطالعہ میں مدد دے سکتے ہوں، ان کے مطالعہ سے بہت سے ایسے گوشے سامنے آئیں گے جن سے ابتک لوگ ناواقف ہیں، رفتہ رفتہ کئی نادر کتابیں تلاش سے نکل رہی ہیں۔

پنچتنترا کا تقریباً دنیا کے تمام متمدن ممالک میں بار بار ترجمہ ہو چکا ہے، اس کے تقریباً ساٹھ زبانوں میں دو سو ترجمے موجود ہیں، اور جاوا سے لیکر آئس لینڈ تک اس کا دائرہ پھیلا ہوا ہے، علماء و محققین نے اس موضوع پر بہت کام کیا ہے، اور تقریباً تمام ترجموں کا پتہ لگایا ہے، پھر بھی ایک بیحد اہم ترجمہ ان کی نظروں سے پوشیدہ رہ گیا، ابھی حال میں اس ترجمہ کا پتہ چلا ہے جس کا نام پنچاکیانہ ہے، اور جسے مصطفیٰ خالقداد عباسی نے شہنشاہ اکبر

کے حکم سے براہ راست سنسکرت سے ترجمہ کیا تھا، اس کا واحد قلمی نسخہ نیشنل میوزیم، نئی دہلی میں موجود ہے۔ (نمبر ۶۲۰۱۰۰۵)

ہندوستان کے قرونِ وسطیٰ کے تاریخی اور تہذیبی مطالعہ کے لیے کچھ محدود کتابیں جنکو لوگ پہلے اصل زبان میں پڑھا کرتے تھے، لیکن اب زیادہ تر ان کے ترجموں سے کام نکالا جاتا ہے، جس سے مطالعہ کرنے والے کتاب کی اصل روح سے دور ہوتے جا رہے ہیں، ترجموں میں غلطیوں کے امکانات بھی ہوتے ہیں، جن سے غلط نتیجے نکل سکتے ہیں۔

ان کے علاوہ بیشمار ایسی کتابیں اور تذکرے ہیں، جن کا ابتک کسی زبان میں ترجمہ نہیں ہوا ہے، اور ان کے ماخذ سے عام طور پر لوگ محروم رہتے ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ اس قسم کی اہم کتابوں کا زیادہ سے زیادہ ترجمہ کیا جائے، اور ان کے متن کو معیاری طریقہ سے شائع کیا جائے اور لوگ اصل متن کے پڑھنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کریں۔

پھر یہ غلط خیال ہے کہ صرف تاریخ کی کتابوں سے مورخین کے لیے مواد مل سکتا ہے، مجھے ڈاکٹر اشرف مرحوم کا کہنا کبھی نہیں بھولتا کہ تاریخ و تہذیب کے مطالعہ کے لیے ادبیات کا مطالعہ ناگزیر ہے، اس سے بڑا مواد مل سکتا ہے۔

چنداین یا داستان مینا و لورک کو مولانا داؤد نے فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں ہندی میں نظم کیا تھا، اور مخدوم شیخ تقی الدین واعظ ربانی دہلی میں اس کے بعض حصوں کو منبر پر پڑھا کرتے تھے جس سے سامعین پر عجیب کیفیت طاری ہوتی تھی، اس زمانہ کے بعض علما نے اس نظم کے پڑھنے کا سبب پوچھا، تو جواب دیا کہ یہ کتاب صاحبانِ عشق کے وجدان اور آیاتِ قرآنی کے مطابق ہے، مولانا داؤد کی چنداین سے شیخ عبدالقدوس گنگوہی اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ فارسی نظم میں اس کا ترجمہ کر دیا، بدقسمتی سے اب اس فارسی مثنوی کے صرف سات شعر لطائف قدوسی

میں محفوظ رہ گئے ہیں عہد جہانگیری میں یہ داستان "عصمت نامہ" کے نام سے منظوم ہوئی ہے۔

اسی طرح نوعی خبوشانی کی ایک مختصر مثنوی "سوز وگداز" ہے، اس کا قصہ یہ ہے کہ ایک حسین دلہن کا شوہر بارات آتے آتے ایک کہنہ مکان کے گرنے سے مرجاتا ہے، وہ ستی ہونا چاہتی ہے، شہنشاہ اکبر کو معلوم ہوتا ہے، تو اسے بلا کر اپنے تخت پر بٹھاتا ہے، اسے رانی کا خطاب دیتا ہے، اور سوائے تخت شاہی کے دنیا کی ہر نعمت اس کے سامنے پیش کر دیتا ہے، مگر وہ کسی طرح ستی ہونے سے باز نہیں آتی، اس وقت بادشاہ شہزادہ دانیال کو حکم دیتا ہے کہ وہ خود جاکر شاہزادیوں کی طرح اس کی ستی کا انتظام کرے، اور جب وہ بیچاری کرب و بیچینی کے ستی ہو جاتی ہے تو شاہزادہ روتے روتے غش کھا جاتا ہے، اکبر بھی اس واقعہ سے بیحد متاثر ہوتا ہے، اور نوعی کو بلا کر کہتا ہے کہ تم لوگ کب تک گل وبلبل کے پارینہ افسانے دہراتے رہوگے، اور اس سچے واقعہ کو نظم کرنے کا حکم دیتا ہے۔

دیوان ہجری کا ایک عمدہ نسخہ انڈیا آفس میں ہے، خواجہ ہجری ہمایوں کے ہمعصر مداح اور درباری شاعر تھے، جب اکبر تخت نشین ہوا تو ہجری نے اس نوجوان بادشاہ کو قصیدوں میں نصیحتیں کرنا شروع کیں، ایک قصیدہ میں اکبر کو غلہ کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کی طرف متوجہ کیا ہے، ایک قصیدہ میں اس کی ژولیدہ باتوں پر متنبہ کیا ہے، اور ان کو سلیقہ سے رکھنے کی تعلیم دی ہے، دیوان ہجری میں بہت سے مطالب وجزئیات میں جو عام طور سے لوگوں کی نگاہوں سے ابتک پوشیدہ ہیں[1]۔

ہندوستان کی بہت سی داستانیں دنیا کے ادب کا حصہ بن چکی ہیں، بلرام دیو داسعت کا قصہ جو اصل میں بھگوان اور بودھی ستوا ہے، دوسری زبانوں کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی

---

[1] معارف۔ ہجری پر مضمون نگار نے ایک مستقل مضمون لکھا ہے جو آئندہ کسی نمبر میں شائع ہوگا۔

کئی مرتبہ ترجمہ ہو چکا ہے، اس قصہ کو "اخوان الصفا" جیسی اہم کتاب میں جگہ ملی ہے، ملا محمد باقر مجلسی نے عین الحیات میں اس قصہ کو خاص طور سے بیان کیا ہے۔

فارسی نے خاص طور سے اس قسم کے قصوں کی مقبولیت میں مدد پہنچائی ہے، اور اس زبان میں ہمارے بیشمار ملکی قصے لکھے جا چکے ہیں، جن میں سے نل دمن، مہابھارت، راماین، طوطی نامہ، سنگھاسن بتیسی، ہیر رانجھا، پدماوت، کام روپ کام لتا، سسی پنون، منوہر و مدھومالتی، مدھاول و کام کندلا، سوہنی مہیوال، منکا و منوہر، ہیار و چندر بدن، چتر کرت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اسی طرح سے بہت سے ہندوستانی قصے مولانا روم کی مثنوی اور دوسری کتابوں میں ملتے ہیں، ہمارے محققین کے لیے ان میں بڑا خزانہ موجود ہے، جس سے علمی اور تہذیبی ارتقا میں گرانبہا اضافہ ہو سکتا ہے، اور بہت سے ایسے واقعات اور نکتے ہیں جو صرف ادبیات کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

شعر کی مناسبت سے فارسی شعراء کے تذکروں میں ہمیں بہت سے خطاطوں، معماروں، موسیقی دانوں، جامہ بافوں، مہرکنوں، قصہ خوانوں، تاجروں، کلالوں، آتشکشوں، کلچہ پزوں، زعفران فروشوں، مصوروں، طبیبوں، دلالوں، سمساروں، حکاکوں، پیشنازوں، خشت پزوں، روغن گروں، زرکشوں، سپاہیوں، مدرسوں، خیاطوں، جوہریوں، نقاشوں، رمالوں، طباخوں، عطاروں، کیمیا گروں، رباب نوازوں، معاروں، نقارچیوں، بقالوں، رفوگروں، واعظوں، حلوہ فروشوں، درویشوں، تعزیہ خوانوں، سیاحوں، کاسہ گروں، منشیوں، جراحوں، ملاحوں، کمانگروں، شاہنامہ خوانوں، قمچی بافوں، حافظوں، متصدیوں، شطرنج بازوں، مہندسوں، تاجروں، ابریشم کشوں، منجموں، مفردہ نویسوں، سجادہ نشینوں، رنگریزوں، آتش پرستوں وغیرہ کے بھی حالات معلوم ہو جاتے ہیں، جن میں سے بعض کو اس لیے کردہ

معمولی پیشوں سے تعلق رکھتے ہیں، ہم کسی اور ماخذ سے معلوم نہیں کر سکتے۔

فارسی کی فرہنگیں اور گرامر وغیرہ زیادہ تر ہندوستان میں لکھی گئیں، اور آج ایرانیوں کو ضرورت ہوئی کہ ان کو شائع کریں۔ برہان قاطع، فرہنگ آنندراج وغیرہ ایڈٹ کرکے شائع اور ہماری چیزیں ایران کے مطبعوں میں چھپکر وہاں کے بازاروں میں فروخت کی جارہی ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ اس قسم کی بنیادی چیزیں بھی زیادہ سے زیادہ ایڈٹ کرکے شائع کیجائیں، جن کی ہمیں اور دوسروں کو ضرورت ہے۔

فارسی کا رشتہ ہندوستان کی دوسری زبانوں سے بھی بڑا گہرا ہے۔ ان زبانوں کے مطالعہ کے لیے بھی فارسی میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے بیشتر بڑے کلاسیکی اردو کے شعرا کا یہ اہم پہلو اپنی کمزوری اور کم علمی کی وجہ سے نظرانداز کر دیا جاتا ہے کہ وہ مستقل فارسی کے شاعر اور نثر نویس تھے، غالب نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ۲

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است

نظیر اکبرآبادی کی علمیت میں لوگوں کو شک تھا، اور جب پالمن نے کہا کہ انھوں نے فارسی میں نو رسالے لکھے اور صاحب دیوان تھے، تو لوگوں کو اس کا یقین نہیں آیا تھا، یہ رسالے اسقدر نایاب تھے کہ خود پالمن ساپت بتا سکے۔ شہباز کو ان میں سے صرف پانچ اور نیاز صاحب کو تین رسالے مل سکے، ابھی حال میں مجھے آٹھ رسالے مل گئے ہیں، جن میں سے دو رسالے "مجمع مضامین" اور "انشای محفل" بھی ہیں جن کا نام بھی آجتک کسی کو معلوم نہ تھا۔ بہرحال اردو کا صحیح مطالعہ بغیر فارسی کے ناممکن ہے۔

یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ موجودہ فارسی شاعری اور ادب تہی مایہ ہے، جس کی شکایت اکثر حضرات کرتے ہیں، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ نئے سبک سے مانوس نہیں ہیں، اگر ہمارے

سلاف سعدی و حافظ، عرفی و نظیری وغیرہ سے استفادہ کرسکتے تھے، تو آج کے شعرا نیما یوشیج و شہریار جیسی عظیم شخصیتوں سے استفادہ کرکے اپنے سرمایہ میں اضافہ کرسکتے ہیں،

کچھ دنوں پہلے فارسی کو زیادہ تر ایک تہذیبی زبان کی حیثیت سے پڑھا جاتا تھا، اب گو اسکے طلبا، کی تعداد کم ہوگئی ہے، مگر تحقیق و انتقاد کے لحاظ سے فارسی میں جو کام ہو رہا ہے اس سے کافی ہمت افزائی ہو رہی ہے، آزادی کے بعد ہندوستان کے پرانے اداروں میں توسیع ہوتی جا رہی ہے، اور نئے نئے تحقیقی ادارے قائم ہوتے چلے جا رہے ہیں، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹیڈیز علی گڑھ، ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹس کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر، ادارۂ مخطوطات حیدرآباد، ریسرچ اینڈ پبلک ڈویژن سرینگر وغیرہ جیسے ادارے روز بروز ترقی کرتے جا رہے ہیں، جن میں نہایت مفید کام ہو رہا ہے۔

ایران و افغانستان وغیرہ سے ہمارے روحانی اور معنوی رشتے قدیم زمانہ سے بہت مستحکم رہے ہیں، ہمیں ان قدیم اور جدید دونوں رشتوں کو استوار کرنا ہے۔

ایران کو ہندوستانی فلسفہ سے اتنا گہرا لگاؤ رہا ہے کہ سترہویں صدی عیسوی میں وہاں کے ایک بڑے فلسفی میر ابوالقاسم فندرسکی "جوگ بشست" کا فارسی ترجمہ یہاں سے لے گئے اور اس پر حاشیہ لکھا، فرہنگ درست کی اور اس کی شان میں ایک قصیدہ لکھا جس میں فرماتے ہیں

چون ز قرآن گذشتی و اخبار
نیست کس را بدین نمط گفتار

سمرقند و بخارا وغیرہ کو بھی ہندوستان سے بڑا تعلق رہا ہے، ابھی حال ہی میں تاجکستان میں "منتخبات ملا عبدالرحمن مشفقی" شائع ہوئی ہے۔ صدرالدین عینی، عبدالغنی میرزایف، ترسون زادہ اور دوسرے تاجکستانی محققین اور علماء نے مشفقی کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے، جن کا یہ مصرع

ضرب المثل ہے:

"از بام خانہ تا ثریا از آن تو"

مشفقی دو مرتبہ ہندوستان آئے اور جب ۹۸۵ھ میں شہنشاہ اکبر پاک پٹن شریف شیخ فرید گنج شکر کے مزار مبارک کی زیارت کو گئے تو مشفقی کی رسائی ان تک ہوئی۔ وہاں کے محققین نے صرف اپنے یہاں کے منابع سے کام لیکر مشفقی کا تعارف کرایا ہے، ضرورت اس کی ہے کہ آئین اکبری، اکبرنامہ، طبقات اکبری، منتخب التواریخ وغیرہ کی مدد سے اس شاعر کا تعارف کرایا جائے جو ہندوستان اور تاجیکستان کو جوڑنے والی ایک بڑی کڑی ہے۔

افغانستان اور ہندوستان قدیم زمانہ سے ایک رہے ہیں، اس زمانہ میں ان دونوں ملکوں کی وحدت کا پتہ اصل سنسکرت کی کتابوں کے علاوہ ان کے ترجموں سے بھی لگایا جا سکتا ہے، جوگ بششت کے فارسی ترجمہ میں جہاں بہت سی فلسفیانہ، روحانی اور اخلاقی داستانیں ہیں، وہاں ہندوستان کے راجہ سورگھو (Suragha) کا بھی قصہ ہے، جو کبھا (Kubha) یعنی کابل کے راجہ پرگھ (Pragha) یا پرناد (Pranada) کا دوست تھا، اور جب راجہ پرگھ کے ملک میں قحط پڑا تو یہاں کا راجہ اس سے ملنے گیا تھا رگ وید (Rig - Veda) کے سات دریاؤں میں سے ایک کا نام کبھا (Kubha) ہے۔

مہاتابدھ کے دو عظیم مجسمے سرخ بدھ اور خاکستری بدھ ابتک بامیان میں پرانی عظمت کا پتہ دیتے ہیں۔

بلخ کو زرتشت سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ اسی بلخ میں بدھ مذہب کا بہت بڑا مندر نوبہار (Nov Vihara) تھا۔ جہاں کابل، ہندوستان اور چین کے زائر جایا کرتے تھے۔ برمک جو اصل میں پرمکھ (Pramukh) ہے ایہاں کا سب سے بڑا پجاری تھا جس کے

خاندان کا اسلامی تہذیب کے سنوارنے میں بہت بڑا حصہ ہے۔ کنشکا اور یونانی بادشاہ مینندر (Menander) دونوں بدھ مذہب کے پیرو تھے، ایران و ہندوستان کے تصوف نے خصوصیت سے بودائی اور ہندی فلسفے کے زیر اثر نشو ونما پائی ہے۔ اور یہاں کے نروانا (Nirvana) نے وہاں فنا کی شکل اختیار کی ہے، یہ تصوف تو سرزمین بلخ میں پروان چڑھا جو صدیوں بدھ مذہب کا مرکز رہ چکا تھا، نیز ایرانی تصوف کے بڑے بڑے پیشوا ابو اسحٰق ابراہیم بلخی، ابو علی شقیق بلخی اور عبد الرحمٰن بلخی جیسی شخصیتیں رہی ہیں، سب سے بڑے صوفی شاعر مولانا رومی اسی خاک پاک سے تعلق رکھتے تھے۔

مغل مصوری کا اصل مسکن ہرات ہے، یہ وہ جگہ ہے جہاں خواجہ عبد اللہ انصاری اور ملا عبد الرحمٰن جامی جیسی ہستیاں آرام کر رہی ہیں، غرض ان تمام گوشوں پر از سر نو کام کرنے کی ضرورت ہے، جن میں فارسی ادب کا بہت زیادہ حصہ ہے۔

اب فارسی کو صرف ایک مردہ یا کلچرل زبان کی حیثیت سے نہیں پڑھنا چاہیے، بلکہ اس لیے اس کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ وہ زندہ ملکوں کی زبان ہے، جن سے ہمارے تعلقات روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں، اس لیے اگر ایک طرف ہمیں گذشتہ تاریخ و تمدن کے مطالعہ کے لیے کلاسیکی ادب کی ضرورت ہے تو دوسری طرف ہمیں ایسی فارسی بھی سیکھنی ہے جو ہمیں ہمسایہ اور دوست ملکوں کو سمجھنے اور سمجھانے میں مدد دے سکے۔

دہلی یونیورسٹی اور دوسری یونیورسٹیوں میں بی، اے اور ایم، اے کلاسوں کے علاوہ جدید فارسی کے ایسے سرٹیفکٹ اور ڈپلوما کورس بھی کھولے گئے ہیں جن سے لوگوں کو فارسی بولنے، لکھنے اور جدید لب و لہجہ کے سمجھنے میں مدد مل سکے اور وہ ریڈیو، وزارت، سفارت وغیرہ میں بغیر غیر ملکی امداد کے اپنا کام خود چلا سکیں، آل انڈیا ریڈیو کے فارسی شعبہ میں پہلے بیرونی لوگ کام

کرتے تھے اور انھیں پر ہمارا دار و مدار تھا، مگر اب رفتہ رفتہ ہندوستانی ان کی جگہ لیتے جا رہے ہیں۔

ہندوستان اور ایران دونوں ملکوں میں فارسی کے لسانی مطالعہ کا رواج نہیں تھا، فارسی زبان دوسری زبانوں سے نکلی ہے، اس لیے فارسی کا صحیح مطالعہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ان زبانوں کا بھی مطالعہ نہ کیا جائے جنھوں نے اس زبان کے بننے اور سنورنے میں مدد دی ہے، سنسکرت اور اوستا کی ماں ایک اور زبان تھی جس کا اب وجود نہیں ہے لیکن ان کی مشابہت اور یگانگت بتلاتی ہے کہ ان کی ماں کیسی رہی ہوگی، اسی طرح فارسی باستان، پہلوی، سغدی وغیرہ بھی اوستا اور سنسکرت سے بہت قریب اور آریائی زبانیں ہیں، اس لیے فارسی کے سائنٹفک مطالعہ کے لیے سنسکرت اور اوستا وغیرہ کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

ہماری یونیورسٹیوں میں ابتک سنسکرت اور فارسی کو ساتھ ساتھ نہیں پڑھایا جاتا حالانکہ ان دونوں کے ساتھ تعلیم دینے سے دونوں کے مطالعہ میں مدد ملے گی، پارسیوں کے یہاں اوستا اور پہلوی کا مطالعہ مذہبی حیثیت سے ضروری ہے، اس لیے بمبئی کے اطراف میں ان زبانوں کا رواج تھا لیکن اب شمال میں بھی ان کی طرف توجہ کی جا رہی ہے، دہلی یونیورسٹی میں چند برسوں سے فارسی باستان، اوستا اور پہلوی کو بھی نصاب میں داخل اور ان کے پڑھانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ ہندوستانی محققین اس نکتہ سے غافل نہیں ہیں۔ S. K. Sen کی کتاب Old Persian اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے، مگر اب اس کی طرف باقاعدہ اور منظم طریقہ سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ادب کی تاریخی لغوی اور اصطلاحی ماہیت

از جناب وقار احمد صاحب رضوی، ایم، اے

ادب کائنات کا علم بھی ہے اور اس کا عرفانِ تام بھی، وہ علم اور تہذیب کی دولت کو عام کرتا ہے، مادی اور جمالیاتی دنیا میں حسن کی تخلیق کرتا ہے۔ اور زندگی کی مادی جدلیت کو اقدار عالی سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ وہ فنی تجربات کی نفسیاتی تشریح کرتا ہے۔ ماورائیت کی لاشعوری توجیہ بھی ہے اور تاریخی روایت پرستی اور انفرادیت کا شعوری امتزاج بھی۔ حیاتیاتی تصور ادب کی نوعیت کو قدر و قیمت کا اندازہ عطا کرتا ہے۔ ادب تحلیل نفسی میں، جبلتوں کے سہارے عمل اور زندگی کی منزلیں طے کرتا ہے۔ وہ ماضی بعید سے بعید از فہم ابد کی طرف کسی نامعلوم راستے سے سفر کرتا ہے اور اپنے خوش آیند نغموں سے فضا کو مترنم کردیتا ہے۔

ادب ایک ایسا عمل ترکیب ہے جو ہیئت نامیہ کے منتشر رجحانات میں ربط قائم کرتا ہے، سماجی قدروں اور انسان کی فطری خواہشوں کا تصادم فنکار کو فنی اظہار و ابلاغ کی طرف لیجاتا ہے۔ ابلاغ، تخلیقی ادب کا ایک شعبہ ہے، ادب، اظہار کا ایک ڈھنگ ہے۔ وہ ادیب کے احساس کی نمائندگی بھی کرتا ہے اور حسن، لطافت اور رنگینی کو اثر اندازی کی طاقت بھی دیتا ہے۔ وہ فطرت کا اظہار بھی ہے اور خارجی حقائق کے شعور و ادراک کا نتیجہ بھی ہے۔

ادب نفس انسانی میں شائستگی، افکار و خیالات میں روشنی، احساسات میں نزاکت، زبان میں سلاست اور زور پیدا کرتا ہے۔ ادب کا اطلاق ان تصانیف پر بھی ہوتا ہے،

جو کسی علمی یا ادبی تحقیق کا نتیجہ ہوں۔ اور ان کتابوں پر بھی جو فکر وفن میں باہمی تاثر اور انشاء و اسلوب نگارش کی بہترین مثال تصور کیجاتی ہیں۔

ادب کی ابتدائی تاریخ اور آغاز کے بارے میں کوئی نص صریح یا برہان قاطع ایسی نہیں ہے جو اس کلمے کی تاریخی حیثیت سے بحث کرے۔ یہ ایک ایسی خبر ہے جس کی ابتدا کا سراغ نہیں ملتا۔ اس لفظ کا وجود نہ سامی زبانوں میں ملتا ہے اور نہ عربوں کی جاہلی شاعری میں۔ عہد جاہلی کی تاریخوں میں کچھ اقوال ایسے ضرور ملتے ہیں، جن کے مطالعہ سے اس سلسلے میں مدد ملتی ہے۔ اس ذیل کا ایک قول تو وہ ہے جو حیرہ کے بادشاہ نعمان بن منذر نے کسریٰ کے نام ایک خط میں تحریر کیا تھا۔ اس میں لکھا تھا:

وقد اوفدت ايها الملك!	اے بادشاہ! میں عرب کے ایک گروہ کو آپکے
رهطا من العرب لهم فضل	پاس وفد بنا کر بھیج رہا ہوں۔ جو حسب و نسب
في احسابهم وانسابهم و	میں فضیلت رکھتے ہیں، یہ لوگ دانشمند بھی
عقولهم وآدابهم[1]	اور صاحب اخلاق وآداب ہیں۔

اور دوسرا قول وہ ہے جو علقمہ بن علاثہ نے کسریٰ کے سامنے کہا:

فليس من حضر له منا بافضل	ہم میں جو لوگ آپ کے پاس آئے ان کو
ممن عزب عنك، بل لو قست	ان لوگوں پر فضیلت حاصل نہیں ہے جو
كل رجل منهم وعلمت منهم	نہیں آئے کہ اگر آپ ان کا باہم موازنہ
ما علمنا لوجدت له في آبائه	کریں اور جتنا ہم کو ان کے بارہ میں
انداداً واكفاءً كلهم الى الفضل	علم ہے، اتنا آپ بھی جان لیں تو آپ انکو

[1] ابن عبد ربہ: العقد الفرید ج ۱ ص ۱۲۰ (۱۳۹۳ھ)

منسوب و بالشرف السؤدد	ہمارے ہم سر ہم مرتبہ پائیں گے، وہ سب
موصوف و بالرای الفاضل	صاحب فضل و شرف ہیں، ان میں سیادت ہے
و بالادب معروف[1]	اور وہ اعلیٰ رائے سے موصوف اور ادب سے آراستہ ہیں۔

یہ روایات اور اقوال ہیں، ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، ممکن ہے بعد میں وضع کیے گئے ہوں، ان روایات سے جہاں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ جاہلی عربوں کا تصور، ادبی، سیاسی اور اجتماعی زندگی کے متعلق کیا تھا۔ وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لفظ عرب نژاد ہے، دخیل نہیں ہے۔ اس لفظ کے عربی الاصل ہونے کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ عربی زبان میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں، جو حروف مادہ میں کلمۂ ادب سے مناسبت رکھتے ہیں اور صوتی اعتبار سے قریب المخرج اور قریب المعنی ہیں، جیسے بَدَأَ، أَبَدَ، دَأَبَ۔ ان الفاظ میں جنسی معنی سب میں مشترک ہیں، کیونکہ تعلق بالشی اور ارتکاب عادت کا مفہوم سب میں پایا جاتا ہے۔

بعض محققین (جرجی زیدان اور زیات وغیرہما) کا خیال ہے کہ یہ لفظ عربی اور دوسری سامی زبانوں میں سُمیریوں کی زبان سے آیا، جو قدیم زمانے میں جنوبی عراق میں آباد تھے۔ ان سے حملہ آوروں (سامیوں) نے اس لفظ کو اڑا لیا۔ سُمیریوں کے یہاں اس لفظ کے معنی انسان تھے۔ سامی زبانوں میں یہ لفظ ادب سے أدم اور ادم سے آدم ہو گیا۔ لیکن عربوں نے اس لفظ کو اپنی اصلی حالت میں محفوظ رکھا۔ عرب صحرائی زندگی بسر کرتے تھے، ان کی زبان دوسری زبانوں سے خلط ملط نہیں تھی، انھوں نے اس لفظ کو آدمیت یا انسانیت کے معنی میں استعمال کیا۔ اور لازم بول کر ملزوم مراد لیا۔ اس میں

---

[1] ابن عبد ربہ: العقد الفرید ج۱ صفحہ ۱۲۰ (۱۲۹۳ھ)

فضائل حمیدہ اور شرافت کا مفہوم پیدا کیا، مگر یہ ایک مفروضہ ہے، حقیقت علمیہ نہیں۔

قریش کی زبان اسلام کی سیاسی، سماجی اور مذہبی زبان ہے۔ قریش کی زبان نے عرب کی دوسری زبانوں کو بھی متاثر کیا اور خود بھی ان سے متاثر ہوئی۔ قرآن مجید اسی زبان میں نازل ہوا ہے ادب کے معنی تہذیب و تادیب کے لیے جاتے ہیں، یہ کلمہ سبک اور فصیح ہونے کے باوجود اگرچہ قرآن شریف میں بعینہٖ نہیں آیا ہے، لیکن ادب کا معنوی وجود قرآن میں ملتا ہے، قرآن معلم اخلاق ہے، تہذیب نفس اور اخلاق کا مبلغ ہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید میں الفاظ کی بلاغت یعنی ادب کا لفظی مفہوم اور تہذیب اخلاق کی تعلیم یعنی ادب کا معنوی مفہوم ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوال صحابہ سے عربی زبان میں، لفظ ادب کے وجود کی تائید ہوتی ہے، مشہور حدیث ہے:

اَدَّبنی ربّی فاَحسَنَ تادِیبی — میرے پروردگار نے میری تربیت کی اور خوبی سے کی۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ان هذا القرآن مادبة الله فی الارض فتعلموا من مادبتہٖ[1] — بیشک قرآن اس دنیا میں ایک خوان الٰہی ہے پس اس خوان سے تم لوگ استفادہ کرو۔

مادبۃ: ادب سے بطور تشبیہ اسم مکان ہے۔

حضرت علیؓ کا قول روایت میں آیا ہے:

اما اخواننا بنی امیۃ فقادۃ ادبۃ[2] — ہمارے بھائی بنی امیہ دسترخوان والے لیڈر ہیں۔

اس روایت میں اَدَبَۃٌ، آدِبٌ کی جمع ہے، جیسے کاتب کی جمع کَتَبَۃٌ۔ آدب:

---

[1] ابن الاثیر: النہایۃ، مادۂ ادب۔ [2] ایضاً

اس شخص کو کہتے ہیں جو دسترخوان کی طرف بلاتا ہے، مادُبَۃ اس کھانے کو کہتے ہیں جو دعوت کے لیے تیار کیا جاتا ہے، اس تشریح سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس لفظ کے اصل معنی کھانا ہیں، جیسا کہ بعض علمائے لغت کا خیال ہے، ان احادیث اور اقوال سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لفظ عہد رسالت، عہد صحابہ اور خود ایام جاہلیت میں جانا پہچانا تھا، صدر اسلام میں اس کے جو معنی تھے، اس میں وسعت پیدا ہوئی، اور وہ اخلاق کریمہ اور ان سے زندگی پر پڑنے والے اثرات کے معنی میں بولا جانے لگا، دعوتِ طعام ہو یا دعوتِ تہذیب جنس بہرحال دونوں میں مشترک ہے۔

ادب کے لغوی معنی دعوتِ ولیمہ اور اصطلاحی معنی دعوتِ تہذیب نفس ہے، جنس کے اشتراک اور فصل کے امتیاز سے دو نوعیں ہیں۔ چونکہ یہ لفظ عہد جاہلیت اور صدر اسلام میں کھانے اور تہذیب و تربیت کے مفہوم میں تھا، اور اب بھی یہی معنی ہیں، اس لیے یہ لفظ منقول ہے، مرتجل[1] نہیں ہے۔

”لسان العرب“ میں ادب کے لغوی معنی دعوت: بلانا ہے، وہ کھانا جس کی طرف لوگوں کو بلایا جاتا ہے، اس کو مدعاۃ اور مادبۃ کہتے ہیں، وہ لٹریچر جس سے ادیب، متادب ہوتا ہے اس کو ادب اس لیے کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کو اچھائیوں کی طرف بلاتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔

”المحیط“ میں الادَبُ (متحرک الاوسط) کے معنی لطافتِ طبع اور خوش اطواری کے ہیں۔ ادّبہ: علمہ۔ سکھایا۔ تأدّبَ بہ: تعلّمَ بہ۔ سیکھا۔ الادْب بسکون (العین) کے معنی تعجب کے ہیں۔ جیسا کہ الادبۃ (بالضم) کے معنی تعجب اور پسندیدگی کے ہیں۔ اور ادب البحر کے معنی پانی کی زیادتی ہے۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ لغوی اور مستعمل فیہ معنی میں جنسی اشتراک ہے، کیونکہ ادب محامد و محاسن کی طرف بلاتا ہے۔

[1] معنی موضوع لہ اور مستعمل فیہ میں مناسبت ہو تو منقول ہے، جیسے صلوٰۃ اور اگر مناسبت نہیں ہو تو مرتجل ہے

اس کے علاوہ مادۂ ادب کا ایک اور دلچسپ پہلو ہے، اس کو اٹلی کے مشہور مستشرق کارلونالینو (متوفی ۱۹۳۸ء) نے بیان کیا ہے، مستشرق مذکور کی رائے یہ ہے کہ ادب، دأب سے نکلا ہے، جس کے معنی عادت ہے، یہ لفظ مفرد سے نہیں بنا بلکہ جمع سے مشتق ہے، دأب کی جمع ادأب تھی، قلب مکانی سے آداب ہوگیا، جیسے بئرٌ اور رئمٌ کی جمع أبآر اور أرآم تھی، قلب مکانی کے بعد آبار اور آرام ہوگئی۔ پروفیسر نالینو نے اس سے آگے لکھا ہے:

وكثر استعمال الآداب جمعاً للدأب حتى نسي العرب أصل هذا الجمع وما كان فيه من قلب فخيل اليهم انه جمع لا قلب فيه فاخذوا منه مفرداً ادباً لا دأباً وجرى استعمال هذه الكلمة بمعنى العادة. ثم انتقل من هذا المعنى الطبيعي القديم الى معناه الأخرى المختلفة[1]

داب کی جمع آداب کا استعمال اسقدر زیادہ ہوا کہ عرب اس کی اصل ہی کو بھول گئے نہ انکو یہ یاد رہا کہ اس میں قلب مکانی ہوا ہے، ان کو اس بات کا خیال رہا کہ یہ لفظ جمع ہے اس میں قلب مکانی نہیں ہوا ہے، انھوں نے اس کا مفرد داب کے بجائے ادب سمجھا داب کا استعمال عادت کے معنی ہی میں رہا، پھر وہ اس قدیم طبعی معنی سے دوسرے مختلف معنی کی طرف منتقل ہوا ہے۔

لفظ ادب کی اصل تاریخ بنی امیہ کے عہد سے شروع ہوتی ہے۔ یہ لفظ بنی امیہ ہی کے زمانے میں رائج اور شائع ہوا، اسی زمانے سے اس لفظ کا استعمال سب سے پہلے تعلیم و تربیت کے معنی میں ہوا عہد بنی امیہ میں اساتذہ کی ایک ایسی جماعت تھی جو امراء کے لڑکوں کو تعلیم و تربیت دینے پر مامور تھی، اس جماعت اور اشعار کے راویوں اور تاریخی واقعات بیان کرنے والوں کو "مؤدب"

---

[1] تاریخ الادب العربیہ تالیف کارلونالینو، ص ۱۱

کہا جاتا تھا۔ اس جماعت "مؤدبین" میں سے کچھ نام یہ ہیں: (۱) ابو معبد الجہنی (۲) عامر الشعبی۔

(۱) ابو معبد الجہنی (۲) عامر الشعبی۔ یہ دونوں خلیفہ عبد الملک بن مروان کے لڑکوں کو تعلیم دیتے تھے۔

(۳) صالح بن کیسان: خلیفہ عمر بن عبد العزیزؒ کے لڑکوں کا مؤدب تھا۔

(۴) جعد بن درہم: آخری اموی خلیفہ مروان بن محمد کا مؤدب تھا۔

اس دور کی تحریروں میں جا بجا لفظ ادب کا تذکرہ ملتا ہے، زیاد بن ابیہ اپنے خطبہ "البتراء"[۱] میں کہتا ہے:

فادعوا اللہ بالصلاح لائمتکم — تم خدا سے اپنے ائمہ کیلئے راستی اور خیر کی
فانھم ساستکم المودبون لکم — دعا کرو، کیونکہ وہ تمھارا انتظام کرنیوالے
اما واللہ لاؤدبنکم غیر — اور ادب سکھانے والے ہیں، خدا کی قسم
ھذا الادب او لتستقیمن — میں تم کو اس طرز ادب کے سوا ادب
سکھاؤں گا، ورنہ تم اپنی روش درست کر لو۔

کسی فزاری شاعر نے لفظ ادب کو اپنے اشعار میں اس طرح استعمال کیا ہے،

اکنیہ حین انادیہ لاکرمہ — ولا القبہ والسوءۃ اللقبا

میں ہر محل ازراہ احترام اسکو کنیت سے پکارتا ہوں، لقب سے یاد نہیں کرتا کیونکہ لقب بری چیز ہے۔

کذاک ادبت حتی صار من خلقی — انی وجدت ملاک الشیمۃ الادبا[۲]

میری تہذیب تربیت اس طور پر کیگئی ہے کہ ادب میری سرشت بن گئی ہے اور میں نے اپنی خصلت کا مدار ادب کو بنالیا ہے

۱؎ جس خطبے کو حمد و ثنا سے شروع نہ کیا جائے اور جس کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے نہ ہو اس کو "البتراء" کہتے ہیں، بتر کے معنی دم کٹے، لاولد کے ہیں، اور جس خطبے کو قرآن مجید کی آیات اور درود سے مزین نہ کیا جائے اسکو "شوہاء" کہتے ہیں، شوہاء کے لغوی معنی بد صورت عورت کے ہیں۔ ۲؎ حماسہ: باب الادب۔

بنی امیہ کے زمانے میں اس لفظ کا اطلاق اس قسم کے علوم پر ہوتا تھا جن کا مذہب اور دینیات سے کوئی تعلق نہ ہو۔ جیسے شاعری، کہانی، انساب، ایام عرب، اخبار، احوال، شرافت اور حسن اخلاق بھی اس سے مراد لیے جاتے تھے۔ پھر جب لغت مدون ہوا تو وہ بھی ادب میں شامل ہو گیا۔

لفظ ادب کا مادہ نہ قریشی زبان میں ملتا ہے، نہ عبرانی اور سریانی میں۔ قرآن مجید نے تمام لغات قریشیہ کا استیعاب نہیں کیا تھا، اس لیے یہ بھی فرض کیا جا سکتا ہے کہ یہ لفظ عہد بنی امیہ میں قریش کی زبان میں کسی ایسی عربی زبان سے منتقل ہو کر آیا ہو جو خود برباد ہو چکی تھی۔

"لسان العرب" نے مادۂ ادب سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔

الادب ادبان: ادب النفس وادب الدرس۔ ادب دو ہی چیزوں کا نام ہے ایک تہذیب نفسی اور دوسرے تعلیم شعر و نثر۔ تہذیب نفس۔ بردباری، عالی ظرفی، شجاعت، سچائی جیسی خصائل حمیدہ اور اجتماعی خوبیاں پیدا کرنے کی تلقین کو کہتے ہیں، غالباً یہی وجہ ہے کہ عبداللہ ابن مقفع (متوفی ۱۴۲ھ) نے اپنی کتاب کا نام "الادب الصغیر والادب الکبیر" رکھا، ادب کے دوسرے معنی تعلیم کے ہیں، اس کا تعلق شعر اور نثر سے ہے، پہلی صدی ہجری سے ابتک مادۂ ادب انہی دو معنوں پر دلالت کرتا رہا ہے۔

خلیفہ عبدالملک بن مروان نے اپنے لڑکوں کے مؤدب سے کہا:

علمهم الشعر يمجدوا وينجدوا[1] — انکو اشعار کی تعلیم دو تاکہ یہ شرف حاصل کریں اور دلیر بنیں

یہاں تادیب کے معنی تعلیم و تہذیب یا درست کرنے کے ہیں۔

خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؓ نے اپنے مؤدب سے پوچھا

---

[1] نقد النثر ص ۰،

کیف کانت طاعتی ایاك و	جب آپ مجھے تعلیم دیتے تھے تو میں آپ کی
انت تؤدّبنی؟ قال: احسن	کس طرح اطاعت کرتا تھا، مودب نے جواب دیا
طاعة. قال: فاطعنی الآن	بہترین اطاعت، عمر بن عبدالعزیز نے کہا
کنت اطیعك[1]	تو اب تم میری ویسی ہی اطاعت کرو
	جیسی میں تمھاری اطاعت کرتا تھا۔

بنی امیہ ہی کے عہد سے ادیب یا مودب، شاعر اور نثر نگار کے درمیان فرق قائم ہوا۔ جس شخص پر ادب اور اس کی تعلیم کا غلبہ ہوتا تھا، اس کو ادیب کہتے تھے، اور جس کا رجحان شاعری کی طرف ہوتا تھا، وہ شاعر کہا جاتا تھا، اور نثر کا مطالعہ کرنے والے کو نثر نگار کہا جاتا تھا۔

دوسری صدی ہجری کے نصف اول میں جب عربی علوم، لغت، نحو، صرف کا نشو ونما ہوا تو ان ناموں نے اصطلاحی شکل اختیار کر لی، اور یہ علوم "ادب تعلیمی" میں داخل ہو گئے، ادب تعلیمی کا مفہوم وسیع ہو گیا۔ لفظ ادب کا اطلاق۔ نثر و نظم، انساب، اخبار، لغت، نحو، صرف اور نقد پر ہونے لگا۔ یہ حالت زیادہ دنوں قائم نہیں رہ سکی، کیونکہ یہ عباسیوں کے زمانے میں سوسائٹی کے اجتماعی ہیئت میں تغیر اور ثقافتی گوشوں میں تنوع پیدا ہوا۔ عباسی تمدن کے ساتھ ساتھ علوم عربی کی ایک ایسی طاقت آئی جس نے مادۂ ادب کو متاثر کیا۔

تیسری صدی ہجری میں ادب پھر اپنے اسی مفہوم کی طرف واپس لوٹا، جو پہلی صدی ہجری میں تھا، یعنی ادب فنی اور تہذیب نفس کے معنی دینے لگا۔ اس تعریف میں شعر و نثر اور ان سے متعلقہ علوم۔ اخبار، انساب، ایام عرب اور احکام نقد داخل ہیں، البتہ اس میں فنی نثر اور ادبی تنقید کا اضافہ ہو گیا۔

---

[1] عیون الاخبار لابن قتیبہ ج ۱ ص ۳۰۱ طبع مصر ۱۳۴۳ھ

اس صدی میں اعلیٰ ادب تصنیف ہوا۔ جاحظ (متوفی ۲۵۵ھ) کی "البیان والتبیین" ابن قتیبہ (متوفی ۲۷۶ھ) کی "الشعر والشعراء" اور "کامل" للمبرد (متوفی ۲۸۵ھ) جو عربی ادبیات میں امہات الکتب تسلیم کیجاتی ہیں، اسی صدی میں لکھی گئیں۔

اس صدی میں لفظ ادب کے تہذیب نفس والے معنی میں وسعت پیدا ہوئی، اور اس موضوع پر کچھ کتابیں بھی تصنیف کی گئیں، امام ابو یوسف (متوفی ۱۸۲ھ) کی "ادب القاضی" ابن قتیبہ کی "ادب القراءۃ"۔ ابو العباس سرخسی (متوفی ۲۸۶ھ) کی "ادب النفس" اور کشاجم الشاعر (متوفی ۳۵۰ھ) کی "ادب الندیم" اس سلسلے کی اہم کتابیں ہیں۔ صحیح بخاری (متوفی ۲۵۶ھ) کا "باب الادب" اور حماسۂ ابی تمام (متوفی ۲۳۱ھ) کا "باب الادب" بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ محمد بن سلام الجمحی (متوفی ۲۳۲ھ) کی مشہور کتاب "طبقات الشعراء الجاہلیین والاسلامیین" ابو الحسن الماوردی (متوفی ۴۵۰ھ) کی "ادب الدنیا والدین" اور نیشاپوری (متوفی ۴۴۵ھ) کی "آداب الصوفیہ" اور "آداب البحث والمناظرہ" کا ذکر بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔

جاحظ نے لفظ ادب کئی جگہ استعمال کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

قال عتبۃ بن ابی سفیان لعبد الصمد۔ مؤدب ولدہ: لکن اول ما تبدأ بہ من اصلاح بنی، اصلاح نفسک[1]	عتبہ بن ابی سفیان نے اپنے لڑکے کے مؤدب سے کہا کہ پہلی چیز جس سے تم میرے لڑکوں کی اصلاح کرو، خود تمہارے اپنے نفس کی اصلاح ہے۔

دوسری جگہ لکھا ہے:

وزدنی فی تادیبھم، ازدک فی بری انشاء اللہ تعالیٰ[2]	ان کو ادب سکھانے میں زیادتی کرو، میں حسن سلوک میں زیادتی کروں گا، انشاء اللہ تعالیٰ۔

۱؎ البیان والتبیین ج ۲ ص ۵۰، ۲؎ ایضاً

چوتھی صدی ہجری میں لغت، نحو، صرف ادب سے الگ ہوگئے، نقد، بلاغت، اور بدیع ادب میں شامل رہے۔ خصوصاً ادب میں تنقیدی اور فنی زاویہ نگاہ سے بحثیں ہوئیں۔ اس صدی میں بحتری (متوفی ۲۸۴ھ) اور ابو تمام (متوفی ۲۳۱ھ) کے ادبی معرکوں اور بعد میں متنبی (متوفی ۳۵۴ھ) کے مخالفین اور موافقین کے مباحث نے فن نقد کو فائدہ پہنچایا، آمدی (متوفی ۳۷۱ھ) نے اپنی "الموازنہ بین الطائیین" اور ابو الحسن جرجانی (متوفی ۳۹۲ھ) نے "الوساطۃ بین المتنبی وخصومہ" انہی واقعات سے متاثر ہو کر تصنیف کیں، اس طرح تنقید نے مستقل فن کی حیثیت اختیار کرنا شروع کی۔ اور اس کا شمار علیحدہ ایک علم اور ادبی فن میں ہونے لگا۔

چوتھی صدی ہجری میں جن کتابوں نے فن نقد کو فروغ دیا، اور اس کو مستقل ایک فن کا درجہ دیا، ان میں قدامہ بن جعفر (متوفی ۳۳۷ھ) کی "نقد الشعر" اور "نقد النثر" کے نام سرفہرست ہیں، قدامہ نے سب سے پہلے عربی نقد کے اصول استخراج کیے۔ ان کے بعد ابو ہلال العسکری (متوفی ۳۹۵ھ) نے "الصناعتین"[1] میں اور ابن رشیق القیروانی (متوفی ۴۵۶ھ) نے "کتاب العمدہ" میں انہی کے نقش قدم کی پیروی کی۔ ابو الفرج الاصبہانی (متوفی ۳۵۶ھ) کی "الاغانی" اور ابن عبد ربہ (متوفی ۳۲۸ھ) کی "العقد الفرید" کے نام بھی اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں، "رسائل اخوان الصفا" نے بھی تنقید اور علوم بلاغت کے لیے راستہ ہموار کیا۔

کہا جاتا ہے کہ فن نقد نے علم بلاغت کے ضمن میں مستقل فن کی شکل اختیار کی، اس استقلال کی مظہر شیخ عبد القاہر جرجانی (متوفی ۴۷۱ھ) کی دونوں کتابیں "دلائل الاعجاز" اور "اسرار البلاغت" ہیں۔

---

[1] اس کتاب میں مصنف نے شعر و نثر سے بحث کی ہے، اور جگہ جگہ ان محاسن کی نشان دہی کی ہے جن سے فنی حسن میں اضافہ ہوتا ہے، اس میں فنی تجزیے کے علاوہ تنقیدی بحث بھی ہے۔ مصنف کی دوسری کتاب "دیوان المعانی" بھی اسی طرز پر لکھی گئی ہے، لیکن اس میں روایتی انداز غالب ہے۔

ان کتابوں کا اثر یہ ہوا کہ ادب بمعنی الخاص سے نقد اور بلاغت کا تعلق نہیں رہا۔ اور ادب محض نثر و نظم کے سرمایہ کو کہنے لگے۔

اس استقلال سے فن تنقید کو یہ نقصان پہنچا کہ اس کے بعد فن تنقید یا علم بلاغت میں کوئی ٹھوس کتاب نہیں لکھی گئی، اگرچہ ابن رشیق القیروانی کی "العمدۃ" اور "قراضۃ الذہب فی نقد اشعار العرب" شیخ کے زمانۂ حیات ہی میں تصنیف کی گئیں۔

پانچویں صدی ہجری کے اختتام تک اہم ادبی علوم نے مستقل علوم کی حیثیت اختیار کر لی، شاید اسی وجہ سے زیات نے لکھا ہے کہ عہد اخوان الصفا کے بعد لفظ ادب کا اطلاق فنون، صنعت و حرفت اور تمام غیر شرعی علوم پر نہیں رہا لیکن عربی زبان کے علوم جیسے معانی، بیان، صرف، نحو اسکے دائرے میں داخل رہے لیکن اس قسم کی کوئی تجدید نہیں کی گئی۔[1]

غرض اس صدی میں ادب بمعنی الخاص کی تعریف کو مقبولیت حاصل ہوئی، یہ تجدید اس معنی سے قریب ہے جو قرن اول میں مستعمل تھے۔ اس تعریف سے وہ علوم الگ ہیں جو قرن ثانی میں ادبی تعریف کے جزو رہتے۔ اس صدی میں علماء کی ایک ایسی جماعت پیدا ہوئی جس نے قرن ثانی سے زیادہ ان ادبی علوم کی طرف توجہ دی جو ادبی ثقافت کی تعمیر کرتے ہیں۔

ادبی علوم سے مراد کیا ہے؟ وہ کون سے علوم ہیں جو ادب کی تعریف میں شامل ہیں؟ اس بارے میں علماء کا سخت اختلاف ہے. گذشتہ صدیوں سے اب تک ان ادبی علوم کے حصر و تحدید میں بڑے بڑے علماء نے حصہ لیا ہے۔ ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں:

زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) کے نزدیک علم بارہ (۱۲) ہیں۔ سکاکی (متوفی ۶۲۶ھ) نے "مفتاح العلوم"، یاقوت حموی (متوفی ۶۲۶ھ) نے "معجم الادبا" اور شریف جرجانی (متوفی ۸۱۶ھ)

---

[1] اصول الادب ص ۱۱

نے "مقدمۂ شرح المفتاح" میں ان ادبی علوم سے بحث کی ہے، ان کے علاوہ دوسرے علماء نے بھی رائے زنی کی ہے لیکن اس بارے میں ابن خلدون (متوفی ۸۰۸ھ) کی رائے کو اہمیت حاصل ہے۔

ابن خلدون نے اپنے مشہور مقدمے میں ایک فصل "فی علوم اللسان العربی" کے عنوان سے قائم کی ہے۔ اس میں علوم بلاغت۔ بیان، لغت، نحو پھر ادب سے بحث کی ہے۔ اور ادب کو زبان عربی کے علوم میں ایک مستقل علم تسلیم کیا ہے، اور اس کو نحو، لغت، معانی، بیان اور بدیع کا حریف ٹھہرایا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ہر علم کا ایک موضوع ہوتا ہے جس میں اس کے عوارض ذاتیہ کے سلب و ثبوت سے بحث کی جاتی ہے جیسے طب کا موضوع جسم انسانی ہے، اس حیثیت سے کہ امراض، جسم انسانی کو لاحق ہوتے ہیں اور علاج کے ذریعہ ان کا تدارک کیا جاتا ہے، اسی طرح نحو کا موضوع کلمہ ہے، علم نحو، کلمے کے ان عوارض واحوال سے بحث کرتا ہے جو اس کو باعتبار معرب ومبنی پیش آتے ہیں، اسی ضمن میں نواسخ (عوامل) ضمیر عائد، ان پر فتحہ یا کسرہ کے مقامات کا ذکر آتا ہے۔

تعجب یہ ہے کہ ابن خلدون ادب کو علم تو مانتا ہے، مگر اس کا موضوع نہیں بتاتا، اور اس کی غرض وغایت سے بحث کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ ہر علم کی ایک تعریف، ایک موضوع، اور ایک مقصد ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس نے خود لکھا ہے، ادب کے موضوع سے انکار کرتے ہوئے ابن خلدون نے لکھا ہے۔

ھذا العلم لا موضوع له ینظر	علم ادب کا کوئی موضوع نہیں جس کے
فی اثبات عوارضه اونفیھا	عوارض واحوال سے اثبات ونفی میں
وانما المقصود منه عند	بحث کی جائے۔ اہل زبان کے نزدیک

اصل اللسان ثمرته و هی	ادب کا مقصد ادبی ساخت ہے، وہ
الاجادة فی فنی المنظوم والمنثور	یہ کہ نثر و نظم کے ذریعہ مانی الضمیر کا اظہار
علی اسالیب العرب و مناحیهم[۱]	عرب کے اسلوب اور طریقوں پر کیا جائے،

جب ابن خلدون نے علوم لسانی کی طرح ادب کا کوئی موضوع نہیں پایا تو اس کے موضوع ہی سے انکار کر دیا اگر وہ ادبی نسبت کا اطلاق تمام علوم لسانی پر کرتا تو بات آسان ہو جاتی اور وہ اس اضطراب میں مبتلا نہ ہوتا، جو اس کی حیرانی کا باعث ہوا۔ اس کا یہ فیصلہ منفرد رائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے تحیر و اضطراب کا سبب یہ ہے کہ اس نے ادب کو علوم لسانی ہی میں سے ایک علم سمجھا، جو در اصل ادب کوئی علم نہیں ہے، بلکہ ایک کلامی فن ہے، جو ادیب سے صادر ہوتا ہے۔

ابن خلدون کا ادب کو علوم نظری میں شمار کرنا، اس کو طبیعت یا فطرت سے خارج کرنا ہے۔ ادب تو ایک موہبت مخفیہ ہے، اس کا براہ راست تعلق طبیعت سے ہے، اس فن کی تحصیل، ادب پاروں، اشعار، نثر، لغوی اور نحوی مسائل کے مطالعہ سے ہوتی ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو ادب کا بھی ایک موضوع ہے، اور وہ ہے طبیعت یا فطرت، طبیعت یا فطرت سے مراد واردات (داخلیت) اور تاثرات (خارجیت) ہیں جن سے انسان اس مادی دنیا میں متصادم ہوتا ہے، انسان خارجی حقایق کا مظہر ہے۔ اور طبیعت داخلی کیفیات کی، ان پر تنقید و تبصرہ فطرت انسانی کا تقاضا ہے۔ داخلی یا خارجی عوامل کی ترجمانی کا نام طبیعت یا فطرت ہے، یہی ادب کا موضوع ہے۔

داخلیت اور خارجیت میں ایک واضح فرق ہے، وہ یہ کہ خارجی اشیا یا مدرکات حسیہ

---

[۱] مقدمہ ابن خلدون ص ۳۱۷ مطبوعہ مصر

کا تعلق انسان کے حواس ظاہری سے ہے، وجدان سے نہیں۔ انسان خارجی دنیا میں ان کے تجربے کرتا ہے، اور ان حسیات کو اپنے وجدانی تاثرات یا وجدان سے الگ رکھتا ہے۔ اس کے برخلاف باطنی اشیا کے کہ وہ تجربوں، ضابطوں اور قاعدے قانون کی پابند نہیں، اندرونی احساسات بدلتے رہتے ہیں، ان کا تعلق طبیعت انسانی اور وجدانی تاثرات و انفعالات سے بلا واسطہ ہے۔ آج ایک چیز کو دیکھ کر دل پر خوشی کا اثر ہوتا ہے۔ کل اسی چیز کو دیکھ کر خوشی نہیں ہوتی، اس سے معلوم ہوا کہ داخلیت (قلبی کیفیات) بھی تغیر پذیر ہے۔

ادب کی تعریف کرتے ہوئے ابن خلدون نے لکھا ہے۔

ثم انهم اذا ارادوا حد هذا	جب انھوں نے اس فن کی تعریف
الفن قالوا: الادب هو حفظ	کرنا چاہی تو کہا کہ ادب نام ہے اشعار
اشعار العرب واخبارها	اور ادبی تاریخ کے حفظ اور ہر علم سے
والاخذ من كل علم بطرف	تھوڑا تھوڑا حصہ حاصل کرنے کا، وہ
يريدون من علوم اللسان	لوگ علم سے مراد لسانی یا شرعی
او العلوم الشرعية [1]	علوم لیتے ہیں۔

اس عبارت میں ابن خلدون ادب کو فن تسلیم کرتا ہے، اس سے پہلے اسی ادب کو علم سے تعبیر کر چکا ہے، قطع نظر اس بات کے کہ ابن خلدون کے نزدیک ادب علم ہے یا فن۔ اس عبارت پر ایک اور اعتراض وارد ہوتا ہے، وہ یہ کہ ادب کی مذکورہ بالا تعریف (جسکو ابن خلدون نے اس طرح لکھا ہے، جیسے وہ کسی سے نقل کر رہا ہے۔ ثم انهم اذا ارادوا حد هذا الفن قالوا:) ادب کی ہے یا تأدب کی۔

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۳۱۷

اگر اس سے مراد ادب اور ادبی کتابیں ہیں، جو ہم پڑھتے ہیں اور ادیبوں اور شاعروں
سے سنتے ہیں تو یہ تعریف مکمل نہیں، اور اگر اس تعریف سے ان وسائل کا ذکر کرنا مقصود ہے جن کے
ریعہ انسان اپنے ذوق ادبی کی جلا کرتا، انشاء پردازی کی طاقت کو اجاگر کرتا اور تنقید و تبصرہ
کی صلاحیت پیدا کرتا ہے، تو یہ تعریف تادب کی ہے، ادب کی نہیں۔ کیونکہ تادب ادب سیکھنے
کو کہتے ہیں، جس کا بہترین وسیلہ کتاب ہے، ادب سیکھنے والا، لازمی ثقافت کی تحصیل ان وسائل
سے کرتا ہے، انکا ذکر ابن خلدون نے اس تعریف میں کیا ہے، یہ ثقافت متادب کی زبان درست کرتی ہے۔
اور اس کے ذوق ادبی کو نکھارتی ہے، اس لحاظ سے یہ تعریف ادب کے بجائے تحصیل ادب کی ہوئی۔

آرٹ (جمال)، شعر، خیال اور ادب ایسی اصطلاحات ہیں کہ انکی صحیح منطقی تعریف اسوقت
تک نہیں کیجا سکتی، جب تک ذہن میں ان کا مفہوم واضح نہ ہو، اسکے برعکس اشیائے حسیہ جیسے
مثلث (جیومیٹری) جزیرہ (جغرافیہ) ٹھوس یا سیال اجسام کی تعریف ممکن ہوتی ہے، ابن خلدون
کے تحیر اور اضطرابی کیفیت کا ایک سبب یہی ہے کہ اس کے ذہن میں ادب کا مفہوم واضح نہیں،
یہی وجہ ہے کہ ادب کی کوئی منطقی حد قائم نہیں کر سکا، اور نہ تعریف بالعوارض کرنے میں کامیاب ہوا،
جس سے ادب کی وضعی شکل سامنے آجاتی۔ اس نے جو کچھ تعریف کی ہے وہ جزئی ہے کلی نہیں۔

حاصل اس بحث کا یہ ہے کہ ادب ایک فن کلامی ہے، جو عقل کی تعبیر اور ادراک و شعور انسانی
کی ترجمانی کرتا ہے، وہ ایک مدلول عرضی ہے، اس کا تعلق تہذیب نفس اور انسانی خصائل
سے بھی ہے، اور انفرادی اور سماجی زندگی سے بھی۔

ادب کی بنا جذبہ ہے، جو ادب میں خلود پیدا کرتا ہے، اس جذبہ کی دو حیثیتیں ہیں، ایک کا تعلق خلود ادب
سے ہے، دوسری کا شخصیت ادیب کی ترجمانی سے۔ مادی اجسام کے مقابلہ میں ادبی عبارتیں قائم بالذات
ہوتی ہیں، ان میں باقی رہنے کی ایک ایسی صفت خلود ہوتی ہے کہ نہ اسے زمانہ فنا کر سکتا ہے اور نہ وہ

تحریریں جو موجود ہیں اس موضوع پر لکھی جاتی ہیں، پڑھنے والے ہر عہد میں ان کو پڑھتے ہیں، ان سے کبھی مستغنی نہیں ہو سکتے، عقلِ انسانی ترقی پذیر اور بدلنے والی شے ہے، تغیرات، جذبات کی ابدیت میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکے، اس لیے ادب فی نفسہٖ بقائے دوام کی صلاحیت رکھتا ہے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ جذبہ جلد زائل ہونے والی چیز ہے، اس لیے وہ ادب کی بقا کا باعث نہیں ہو سکتا، لیکن یہ تناقض وہمی ہے، دراصل جذبے کا زوال ہی ادب کی بقا ہے، وہ عاطفہ ہی کی سرعتِ زوال ہے، جو ادبی اثر کو خلود اور انفعالاتِ ادبی کو دوام بخشتی ہے،

اس بات کو کلی کے جذبۂ شگفتگی سے سمجھا جا سکتا ہے، جو ایک سادہ خارجی مثال ہے، غنچہ، جذبۂ شگفتگی ہے، وہ ایک لمحۂ مختصر جس میں کلی مسکرائی، کلی کے بقائے دوام کا سبب بنا، اثباتِ جذبہ نے کلی کو پھول بننے پر مجبور کیا، کلی پھول بن کر کھلکھلائی، پھول زینتِ انجمن اور محوِ چمن آرائی ہوا، اگر کلی پھول نہ بنتی تو ہزار تنگیٔ داماں کی شاکی ہوتی، کلی کا کلی رہنا اس کی موت تھا، جذبۂ شگفتگی نے اسکو جمالِ آگہی دیا اور جہانِ آب و خاک و باد میں لباسِ زندگی سے مزین کیا:

تاثرات کی تعبیر کے وقت ہی ادیب کی شخصیت کھل کر سامنے آجاتی ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں ادب، فن کی شکل اختیار کرتا ہے، اور ادیب کی مزاجی ہیئت اور طرزِ ادا کی بھی ترجمانی کرتا ہے، تاثرِ نفسی کو ادبی خلود اور ادیب کی شخصیت کی ترجمانی میں بڑی اہمیت حاصل ہے، اس سے ادب اور زندگی کا تعلق ظاہر ہوتا ہے، جو جذبات و واردات اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، ان کو اشعار میں منظوم کرتا ہے، وہ جذبات ہم کو اسی طرح متاثر کرتے ہیں جس طرح خود شاعر نے محسوس کیے، اس تعریف کا اطلاق صرف شاعری پر ہی نہیں ہوتا، بلکہ تمام ادب کا یہی حال ہے، ادب تنقیدِ حیات ہے، وہ زندگی کا شعور بھی ہے اور تفسیرِ حیات بھی۔ ادیب کے لیے سماجی شعور کے بغیر تفسیرِ حیات مشکل ہے، ادیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ حیات و کائنات کا مشاہدہ کر کے اپنے اندر سماجی شعور پیدا کرے۔

ادبی تاثیر اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب ادیب خارجی یا داخلی حسیات جمال کی عکاسی اس طور پر کرے کہ تصویر کا حقیقی رخ پڑھنے والے کے سامنے آجائے۔ اس سے دل متاثر ہو اور ایسا ہی محسوس ہو جیسا کہ اصل تصویر میں ہے۔ وہ قوت جو اس تصویر کشی کی تکمیل کرتی ہے، اسکو قوت خیالیہ کہتے ہیں۔

جذبہ اور خیال کی طرح فکر بھی ادب کا ضروری عنصر ہے۔ ادبی موسیقی، جذبہ و فکر کی آمیزش سے نغمے جنم دیتی ہے، اور سروں کو لفظ و معنی کا لباس پہناتی ہے، جو عبارت دل پر اثر کرے وہ ادب ہے اور وہ افکار و حقایق جو ممتزج بالعواطف ہوں وہ بھی ادب ہیں۔ یہ ایک ایسی کسوٹی ہے جس کی روشنی میں ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ تاریخی کتابیں کب ادب بنتی ہیں۔

صحیح افکار، جذبے کو خلود دیتے ہیں، اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم تنقید کی وادی میں قدم رکھتے ہیں، جذبہ نام ہے تاثیر عملی کا۔ شعور، وجدان، حس علم جزئی ہیں تمام جزئیات سے ایک مشترک مفہوم اخذ کرنے کا کام فکر ہے، شعور جزئی ہے اور فکر کلی۔ اس لیے شعور اور فکر کے درمیان اتصال عین حقیقت ہے، خواہ یہ اتصال کمیت میں ہو یا کیفیت میں۔

جذبہ، فکر اور خیال کی طرح اسلوب بھی عناصر ادبی میں داخل ہے، اسلوب ایک حقیقت خارجیہ ہے جو مواد اور صورت کے امتزاج سے ادب کے خوبصورت مرقعے تیار کرتا ہے، وہ تخیل کو حقیقت اور واقعیت کی طرف لے جاتا ہے، ادب میں صورت و معنی کی ہم آہنگی ہی سے مرحلۂ شوق کی دشوار گذار راہ آسان بنجاتی ہے۔

اسلوب جذبات کو برانگیختہ کرنے کا کام دیتا اور افکار کو لباس جمیل سے آراستہ کرتا ہے۔ اگر معانی متوسط اور خیالات فرسودہ ہوں لیکن اسلوب جاندار ہو تو عبارت میں موسیقی اور دلکشی آجاتی ہے، اسلوب ہی عبارت کو موثر اور خوبصورت بناتا ہے، اسلوب عارضی یا اتفاقی چیز نہیں فطری چیز ہے، جو ذوق سے حاصل ہوتا ہے۔

ہیئت۔ غایت ادبی نہیں۔ وہ ادائے معانی یا حقائق کی تعبیر کا ایک ذریعہ ہے۔ اس لیے نہ تنہا مواد سے کام چل سکتا ہے اور نہ شکل و صورت سے۔ ان دونوں میں تناسب ہم آہنگی اور ربط ضروری ہے۔ اسلوب ایک سماجی عمل ہے۔ اچھا اسلوب شعوری یا غیر شعوری طور پر زندگی اور ماحول کا ترجمان ہوتا ہے۔ ہیئت اور اظہار کی سماجی اہمیت یہ ہے کہ وہ ادیب اور قاری کے درمیان تعلق پیدا کرتا ہے۔ جمالیاتی اسلوب۔ نثر میں خیال کا آہنگ اور شعر میں جذبے کا ترنم بن جاتا ہے۔ فنکار اپنے جمالیاتی تجربے یا جذبے کے اظہار میں حسن کی تخلیق کرتا ہے انسان لاشعور، علامتوں اور تمثالوں کا سرچشمہ ہے، علامتی اظہار حسن کاری کو وجدان اور لاشعور سے قریب کرتا ہے۔ لاشعور کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے، جسے اشاریت کہتے ہیں، دروں بینی اور اشاریت اظہار کو ماحول کا داغ اور تہذیب و تمدن کی زبان دیتی ہے، مادی کشمکش سے فنکار کا احساس جمال متاثر ہوتا ہے۔

اشاریت ایک بے ساختہ ذریعۂ اظہار ہے، جو رسمی پابندیوں سے آزاد ہے۔ اس اعتبار سے ایمائی طرز فکر ایک فطری طریقہ ہے۔ وہ نفس کی گہرائیوں سے امنڈ کر نمودار ہوتا ہے، اشاریت، احساس کی ارتقائی منزل ہے، وہ الفاظ کو تصور زائی کی طرف لے جاتی ہے، تصور زائی ایک لازوال عطیۂ فطرت یا ناقابل اعتبار انتقال اسلوب ہے، جو کتاب یا ادبی عبارت کو قیمت خالدہ عطا کرتا ہے۔

ہندی شاعری کا ایک تاریخی جائزہ

از جناب زیدی جعفر رضا صاحب شعبۂ ہندی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۸)

چنتامن | چنتامن (चिंतामणि) تکوان پور (کانپور) کے باشندہ رتناکر ترپاٹھی کے بیٹے تھے، بھوشن مت رام اور جٹا شنکر ان کے بھائیوں کے نام تھے، علامہ آزاد بلگرامی نے ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے،

"چنتامن ساکن کوڑہ جہان آباد است و دو برادر او بھوکن و متررام نیز شاعر خوش فکر مشہور اند ..... در علم سنسکرت سر آمد اقران بود و در سرکار شاہ شجاع بن شاہ جہان بادشاہ با عزت بسری برد"[1]

یہ تماتی عرصہ تک ناگپور میں سورج بنسی بھونسلہ راجہ مکرند شاہ کے یہاں مقیم رہے، اور ان ہی کے حکم پر انھوں نے اپنی تصنیف پنگل قلمبند کی جیسا کہ ان کی تحریر سے واضح ہے۔

سورج بنشی بھوسلا ست ساہ مکرند | مہاراج دگپال جم بھال سمد سبھ چند
چنتامن کو کو حکم کیو ساہ مکرند | کرو سچے پچھ لچھن سہت بھاشا پنگل چھند

چنتامن کا سنہ پیدائش ۱۶۰۹ء تسلیم کیا جاتا ہے، ان کی چھ تصانیف کا پتہ چلتا ہے جنکے نام کابیہ ببیک، کوی کل کلپترو، کابیہ پرکاش، رس منجری، پنگل اور رامائن ہیں، انکے علاوہ کتب خانہ دتیہ میں شرنگار منجری نام کی ان کی ایک اور تصنیف ملی ہے لیکن یہ کتاب دراصل شاہ اکبر

---

[1] علامہ آزاد بلگرامی - سرو آزاد: ص ۲۶۵-۲۶

کی آندھرا بھاشا میں لکھی ہوئی تصنیف ہے، جس کا ترجمہ سنسکرت سے ہوکر ہندی میں چنتامن کے ذریعہ ہوا، راماین کو چھوڑ کر بقیہ سبھی تصانیف کا بیہ شاستر سے متعلق ہیں، ان کا سب سے زیادہ مشہور و مقبول گرنتھ کوی کل کلپترو (कविकुल कल्पतरु) ہے۔

چنتامن کا شمار شرنگار کال کے اساتذہ میں ہوتا ہے، انھوں نے کیشو کی طرح بھامہ اور دنڈی کی تقلید نہیں کی، بلکہ ممٹ اور وشوناتھ کے راستے پر چلے، اور اس کے بعد ریتی کال کے مختلف آچاریہ نے چنتامن کی تقلید کی، رام چندر شکل ایک مقام پر رقم طراز ہیں:

"ہندی ریتی گرنتھوں کا سلسلہ چنتامن ترپاٹھی سے چلتا ہے۔ اسلئے ریتی کال کی ابتدا انہی سے سمجھنی چاہئے" [۱]

لیکن ڈاکٹر نگیندر شکل جی کے اس قول کی تردید کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"چنتامن کو بھی یہ فضیلت عطا کرنا ظلم ہے، کیونکہ یہ محض اتفاق تھا کہ ان کے بعد ریتی کال کا دھارا بغیر کسی رکاوٹ کے بہہ نکلا" (ڈاکٹر نگیندر۔ ریتی کابیہ سنگرہ، صفحہ ۲۲-۱۶)

چنتامن کے کلام کے بارے میں ڈاکٹر جگدیش گپت کا یہ خیال ہے کہ آچاریہ ہونے کے باوجود شعریت کے لحاظ سے چنتامن کا مقام کافی بلند ہے، رس وادی شاعر ہونے کی بنا پر ان کے کلام میں شرنگار رس کا بیان تفصیل سے ہے، لیکن اس میں متیرام اور دیو جیسے شعرائے متاخرین کی جیسی معنویت نہیں پائی جاتی البتہ تخئیل کی سادگی اور زبان کی سلاست کے لحاظ سے یہ متیرام کے مقابلہ میں ضرور لائے جاسکتے ہیں، ان کا کلام مجموعی طور سے نہایت صاف ستھرا ہے، اس میں ایک ترنم اور نغمگی پائی جاتی ہے، (ڈاکٹر جگدیش گپت، ہندی ساہتیہ کوش صفحہ ۱۷۳)

نمونہ کلام یہ ہے:

کیسر بارہ بار تارت کیسر انگ لگاون لاگی
دولہ کے اولوکن کو داڑھان جھوکن آون لاگی

آئی ہو نینن چنچلتا دگ گیا کل آپ چھپاون لاگی
دوس دو تینک تے چنتامن بھاون کی من بھاون لاگی

۱؎ رام چندر شکل: ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۲۵۹

دیو | دیو کا پورا نام دیودت تھا، سنہ پیدائش ۱۶۷۳ء ہے، یہ اٹاوہ کے باشندے تھے جس کا ذکر انھوں نے بھاو ولاس میں کیا ہے،

دیو سریا کوی دیو کو نگر اٹا یو باس ... جو دن نول سبھا ورس کیو بھاو ولاس

اس دوہے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ کانیہ کبج (कान्यकुब्ज) برہمن تھے کیونکہ دیو سریا کانیہ کبج برہمنوں کو کہتے ہیں۔ دیو کی زندگی کا ابتدائی حصہ مالی اعتبار سے اچھا نہیں تھا، ایک غریب گھر میں پیدا ہونے والا یہ فنکار فکر معاش میں مختلف درباروں کی خاک چھانتا پھرا، کبھی اس نے اعظم شاہ کے سنگ در پر سجدہ کے لیے جبین نیاز خم کی اور بھاو ولاس اور اشٹ یام جیسی تصانیف حصول انعام کے خاطر نذر کیں۔ کبھی راجہ سیتا رام کے بھتیجے سیٹھ بھوانی دت کے لیے بھوانی ولاس لکھی، کبھی ریاست پھپھوند کے راجہ کشل سنگھ کی دلجوئی کے لیے کشل ولاس تصنیف کی، کبھی سیٹھ بھوگ لال کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا اور کبھی راجہ ادیوت سنگھ کے نام پر پریم چندر کا پیش کی، کبھی دلی کے رئیس پالی رام کے بیٹے سجان من کیلئے سجان ونود لکھی اور کبھی پہانی کے حاکم اکبر علی خاں کی خدمت میں سکھ ساگر ترنگ پیش کیا۔

دیو کی تصانیف کا دائرہ بڑا وسیع اور ہمہ گیر ہے، ان کی تعداد کوئی ۵۲ بتاتا ہے اور کوئی ۷۲۔ ان میں سے ۱۸ کتابوں کے قلمی نسخے حاصل ہو چکے ہیں۔ شعر نگار کال کے کسی اور شاعر نے اتنی تعداد میں اور اس قدر وسعت نظر کے ساتھ تصنیف نہیں کی، دیو دراصل ایک رومان پرور اور عاشق مزاج شاعر تھے، رومانیت اور تعشق ان کے کلام کا نمایاں حصہ ہے، ان کی منظومات میں سے جس شعر کو بھی اٹھا لیجئے وہ محبت کی چاشنی، رومان کی لذت سے خالی نہ ہوگی۔

دیو کے کلام میں تخیل کو بڑا دخل ہے، وہ تخیل کے سہارے ایسے مجسمے تراشتے ہیں جو حسن کے اعتبار سے بے نظیر ہیں، دیو کی شاعری تاثراتی ہے، اس لیے کشش اور پرکیف بھی ہے، جذبات کے مطابق زبان میں لوچ پیدا کرنا دیو کا خاص حصہ ہے، قواعد کے اعتبار سے دیو کی زبان میں کچھ کمی ضرور نظر آتی ہے لیکن کسی مجبوری

کے تحت ایسا کیا ہے، اس سے اس کی صلاحیتوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا، نمونۂ کلام یہ ہے،

دیو میں سیس بساؤ سنیہ کے بھال مرگمی نبی کے بھاکھیو ۔ کنچکی میں چیر پوکر چپر دا لگائی لیو ادسوں ابلا کھیو

کے کمنول گئے گئے رس مورت ونن سنگار کے جاکھیو ۔ سانورے لال کو سانورو روپ میں کو کچرا کر راکھیو

متِرام متِرام کی پیدایش سمبت ۱۶۷۴ میں ضلع کانپور کے ایک گاؤں تکوان پور میں ہوئی، ڈاکٹر بھگیرتھ مصر نے اس گاؤں کا نام ٹکیا پور لکھا ہے جو صحیح ہے، متِرام، چنتامن اور بھوشن کے بھائی تھے، ان کا کلام شیرینی اور حسن کے لحاظ سے بہت خوبصورت ہے، متِرام کی طبیعت کا جھکاؤ رس کی طرف زیادہ ہے ان کی مشہور تصانیف میں للت للام، رس راج، پھول منجری، چھند سار پنگل، ست سئی، ساہتیہ سار لکچھن سرنگار اور النکار پنچاشکا ہیں، ان تصانیف میں للت للام اور رس راج زیادہ مقبول ہیں۔ للت للام (ललित ललाम) النکار سے متعلق ہے، اور بوندی کے حاکم بھاؤ سنگھ کی تعریف میں ہے، اس میں چترکے علاوہ باقی سب النکاروں کو صنعت معنوی یا آرتھالنکار تسلیم کیا گیا ہے۔ انہیں پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صنعتوں کی تعریف میں شاعر نے کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ چنانچہ اس کی پیش کردہ مثالیں بیشتر مقامات پر صنعتوں کی تعریف سے میل نہیں کھاتیں، تاہم بعض مقامات پر شاعر نے صنعت کی تعریف اور اس کی مثالیں بڑی خوبصورتی سے پیش کی ہیں، مثلاً اُپما النکار یا صنعت تشبیہ کی تعریف وہ یوں کرتا ہے۔

جاکو ورنن کیجئے سوا پمیئہ پرمان ۔ جاکی سمتا دیکھئے تاہ کہت پرمان

جہاں پرنئے ودن کو سم چھب کو اللاس ۔ پنڈت کب متِرام تہہ اپما کہت پرکاس

اور اس کی مثال پیش کر کے اس کو اور واضح کر دیا ہے۔

متِرام کی دوسری مقبول تصنیف رس راج ہے جس میں عشق کے ذیل میں نائیکاؤں کے اقسام پر تفصیل سے لکھا ہے، متِرام کے نزدیک نائیکا وہ ہے، جس کو دیکھ کر قلب کی گہرائیوں میں انبساط یا

رس پیدا ہو ۔

ابھیت جاہ دلیک کے چت بیچ رس بھاؤ

لیکن یہ تعریف ناقص ہے، حریف کو دیکھکر اگر دل میں انتقام کا جذبہ پیدا ہو تو حریف کو نائیکا نہیں کہہ سکتے، رس راج اصلاً کا یہ گرنتھ ہے، شاستر گرنتھ نہیں، شاستریہ کی کسوٹی پر اس میں کمی پائی جا سکتی ہے، شرنگار اور نائیکا بھید کے بیشتر گرنتھ اسی نوعیت کے ہیں، سکھ دیو مصر کا 'رسارنو' بھی نائیکا بھید کا ہی گرنتھ ہے۔ اس کے علاوہ رام جی کا نائیکا بھید گوپال رام کا رس ساگر لبرام کا رس دیویک کلیان داس کا رس چند وغیرہ گرنتھ بھی اسی طرح کے ہیں۔

نائیکا کے بیان میں مترام کا ذیل کا سویا بہت مقبول ہے۔

کندن کو رنگ پھیکو لگے جھلکے ات انگن چارو گرائی ۔ آنکھن میں السان چتونی میں منجو ولاس کی سرسائی

کو بن مول بکات نہیں مترام لہے مسکان مٹھائی ۔ جیوں جیوں نہاریے نیری ہوتے نیوں تیوں کری کرے سی نکائی

متیرام کے نائیکا بھید میں اکبر شاہ کی رس منجری کی ہی تقلید کی گئی ہے، سوکیا یعنی عفیفہ کی تین قسمیں مگدھا (صغیرہ) مدھیا (متوسط) اور پرو ڑھا (کبیرہ)۔ صغیرہ کی قسموں میں نو وڑھا یعنی نازہ اور بشرۃ نو وڑھا یعنی راغبہ، مدھیا یا متوسطہ کی قسموں میں دھیرا (صابرہ) ادھیرا (غیر صابرہ) اور دھیرا ادھیرا (صابرہ غیر صابرہ) اور اسی طرح پرو ڑھا کی بھی دھیرا، ادھیرا، اور دھیرا دھیرا قسمیں۔ اور پرکیا یعنی بیتیہ کی قسموں میں گپتا (مختفیہ)، بدگدھا (فاطنہ) کلٹا (فاسقہ) انوشیانا (فاحشہ) لکچھنا (مستترہ) مدتا (معلنہ) انوڑھا (باکرہ) اور اوڑھا (ثیبہ) کا بیان ہے۔

اس کے علاوہ پریم گربتا، روپ گربتا اور مان گربتا نائیکاؤں کا بیان متیرام نے کیا ہے۔ اس کے بعد پرشت پتکا، کھنڈتا، کلہنترا، بیپرلبدھا، اتکنٹھتا، واسک سجا سوادھین پتکا، ابھسارکا پروتسیت پرسی اور آگت پتکا کا بیان ہے۔ نایک کے اقسام میں متیرام نے پتی، اپ پتی،

و دیبک تین قسمیں درج کی ہیں، اس کے بعد چار طرح کے نایک۔ انوکول، دکچھن، شٹھ اور دھرشٹ کا بیان ہے، یہ اقسام تپی بھید کے ذیل میں ہیں، اُپ تپی اور دیبک کی قسمیں علحدہ بیان کی گئی ہیں۔

مدھنایک | مدھنایک کا ذکر بھکتی کال کے شعراء کے ساتھ کیا جا چکا ہے لیکن مدھنایک چونکہ اصلاً ریتی اور شرنگار کے شاعر ہیں، اسی لیے یہاں ان کا ذکر کرنا اشد ضروری ہے، بلگرام کے ہندی شعراء میں مدھنایک کا مقام سب سے زیادہ بلند ہے، کاویہ شاستر اور موسیقی کے آچاریہ مدھنایک شرنگار کال کے ہندی شعراء کی محفل کا ایک بیش قیمت جوہر ہیں، مدھنایک ایک ہی وقت میں ایک بے مثال موسیقار، ایک کامیاب شاعر، ایک عظیم آچاریہ اور ایک سچے عاشق ہیں۔

مدھنایک (मधनायक) کے تخلص کو ہندی کے محققین نے مختلف انداز سے لکھا ہے، ڈاکٹر بھگیرتھ مصرا اسے مدنایک (मदनायक) لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر برج کشور مصر کے یہاں یہ لفظ مرزا مدنایک ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر شیو لعل جوشی نے اسے مدھونایک (मधुनायक) لکھا ہے اور شری گوپال چند سنگھ اسے مدھنایک لکھتے ہیں۔ مدھنایک کا تخلص در اصل مدھنایک ہی تھا، مدھونایک یا مدھنایک نہیں، چنانچہ شاعر بلگرامی خلف میر عبد الجلیل بلگرامی تبصرۃ الناظرین میں لکھتے ہیں:

"اما مدھنایک لفظے است ہندی بمعنی آں واسطۃ القلادہ یعنی جوہر میانہ جمیل کہ بسیار خوب و گزیدہ تر می باشد، چوں سید مشار الیہ تخلص در شعر ہندی ہمی لفظ می کردند لہذا باین نام اشتہار یافتند۔" (قلمی حبیب گنج فارسی $\frac{۳۷}{۱۴}$ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

مدھنایک نے بھی ایک دوہے میں اپنے اس تخلص کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مکٹ مولِ مَن لال دُتِ ادے ٹیک مَنِ جوت — برن چنی جم ارندھی مدھنایک مدھ ہوت

مدھنایک نے اپنی پوری شاعری میں ایسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے کہ پڑھنے والا ان کی نغمگی میں کھو جانے پر مجبور ہو جاتا ہے، مدھنایک کے اشعار موسیقی کو ساتھ لیکر چلتے ہیں، ذیل میں شاعر نے دھیرا نایکا

کو خوبصورت سیج پر محو خواب دکھایا ہے، شاعر کے انداز بیان اور منظر کشی میں کتنی دلکشی ہے۔

سووت سروج کھی سکھ سمیپ سیج ہت اتھکارن سدن سکھ پاتی کے
ڈھانکی پٹ آنچر لپیٹ نکھ سکھ موتیں پت پیاری نرکھ نرکھ للچاتی کے
پونڈھ ڈھنگ سم بھرم سکچ آن ہت جان پاوے نہ چپل چپل چھوڑن چھپاتی کے
چھاتی لائی لائی ہانتی بھاونتی ایندی کینھیں جیلی پیہ چاہیں لئیں سو دجگائی کے

سر سے پاؤں تک ایک ڈوپٹہ میں لپٹی ہوئی نائیکا کو دیکھ کر اس کا محب مچل اٹھتا ہے، اور آہستہ آہستہ جگا دیتا ہے، جگانے کا انداز بھی خوب ہے، ذیل کے چھند میں نایک کرشن کو زرد رنگ کی پچھوری لپیٹے ہوئے آتا ہوا دیکھ کر نائیکا کی آنکھوں میں ڈبڈبائے ہوئے آنسوؤں کی زبانی شاعر نے جانے کیا کچھ کہہ دینا چاہتا ہے

چندن چیتر بنو تن سانورے کا چھن ھو ہت آوت سوہن
پیت پچھوری پچھا ہن چھاجت نیتن رنگ، چیورت چھو ہن
کنڈل منڈت منجل منجری نوتن نوت لتا کری جو ہن
آنسن کی اولی اچھے مدھنایک بال بلوکت موہن

مدھنایک جی نے اپنی تصنیف مدھنایک سنگار میں رس کے بیان اور نائیکا بھید کو اپنا موضوع قرار دیا ہے، مدھنایک جی کا نائیکا بھید قدیم روایتوں کی تقلید کے باوجود انوکھا اور نرالا ہے، انکی شاعری میں کہیں کہیں فطرت کے خوبصورت مناظر بھی ہیں لیکن فطرت کا آزاد تصور شاعر کے بیان نظر نہیں آتا۔ برسات کا ایک منظر یہ ہے:

بلکت بوندن اکھنڈ دھارا دھارا دھر جیوں دھان دمنی لیٹ دام دامنی
بھرے نیر ساگر امنڈ چلے ندی ندناری کھوری سیت کھیت پنگ پانی جامنی
اور ٹھور لبیکو نیم اتیو پریم کہا موسے آن بھر نیں نہ بھائے بھوری بھامنی
آیئے ہیں جو پیہہ تو کھی کالی نیمی سمجنی لے ہوئی ہیں تئی ناگ نویلی کام کامنی

رسلین بلگرامی | رسلین ہندی کے ایک مقبول شاعر ہیں، ان کا اصل نام سید غلام علی اور تخلص رسلین تھا، انھوں نے فارسی زبان میں بھی شاعری کی ہے لیکن ہندی کے شاعر کی حیثیت سے ان کا جو مقام ہے وہ فارسی میں نہیں ہے، ہندی کا ایک مشہور دوہا جسے اکثر حضرات بہاری کا سمجھتے ہیں، درحقیقت رسلین جی کا نتیجۂ فکر ہے، وہ دوہا یہ ہے

امی ہلاہل مدبھرے سیت سیام رتنار | جیت مرت جھک جھک پرت جہ چتوت اک بار

اس کا اردو منظوم ترجمہ یہ ہے

آب حیات زہر ہلاہل شراب ناب | جھلکے ہے چشم سرخ و سیاہ و سپید سے
جی اٹھے جاں ہلاک کرے کھودے عقل و ہوش | اک بار جو بھی تیری نگاہوں میں دیکھ لے

رسلین جی سید باقر بلگرامی کے بیٹے تھے، ان کی ولادت بلگرام میں ۱۱۱۱ھ میں ہوئی تھی، ان کی تاریخ ولادت علامہ عبدالجلیل بلگرامی نے یہ تحریر کی ہے

نور چشم میر باقر گفت با من | چوں گل خورشید در عالم دمیدم
سال تاریخ تولد خود بگفتم | نور چشم باقر عبد الحمیدم
۱۱۱۱ھ

رسلین کی تصانیف میں رس پربودھ، انگ درپن اور متفرق کتابیں ہیں، رس پربودھ میں ۱۱۵۴ اور انگ درپن ۱۹۰ دوہے ہیں، میر آزاد بلگرامی نے انگ درپن کے دوہوں کی تعداد ۱۸۰ تحریر کی ہے، غالباً انھوں نے آخر کے تین دوہے جو تصنیف کے خاتمے سے متعلق ہیں شمار نہیں کیے ہیں، ان کی کتابوں کی ابتدا شاعر نے حمد و نعت سے کی ہے اسکے بعد بغیر کسی ترتیب کے نایکاؤں کا بیان ہے، رسلین سے متعلق عام ہندی محققین کی طرح ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

"رسلین نے اپنے کو صرف دوہوں تک ہی محدود رکھا ہے اور اس میں بھی انکی توجہ لفظی صنائع اور اظہار کمال پر زیادہ رہی ہے، داخلی جوش اور سوز و گداز پر نہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے غالباً سروآزاد کا مطالعہ نہیں کیا ہے، اگر وہ اس کا مطالعہ کر لیتے تو ان کو یہ غلط فہمی نہ ہوتی کہ رسلین کی شاعری صرف دوہوں تک محدود ہے، میر آزاد بلگرامی نے سروآزاد میں رسلین کے کئی کبت درج کیے ہیں، البتہ لفظی صناعی اور اظہار کمال پر ان کی زیادہ توجہ کا خیال ایک حد تک درست ہے لیکن یہ کہنا کہ ان کی توجہ داخلی جوش اور سوز وگداز پر نہیں تھی، بے بنیاد ہے، رسلین کے داخلی جوش اور سوز وگداز کی ایک مثال ملاحظہ کیجئے: نایک نے پردیس جاتے وقت نائیکا سے اپنے واپس آنے کا ایک وقت معین کر دیا تھا، جو گذر چکا ہے، اور نائیکا بالکل مایوس ہو چکی ہے کہ اچانک نایک آجاتا ہے اور رات بھر نائیکا کے ساتھ رہنے کے بعد دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے علی الصباح چلا جاتا ہے، اس موقع پر رسلین جی نائیکا کی قلبی کیفیت کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں کہ جیسے مشعل ایک مرتبہ روشن ہو کر گل ہو گئی اور دوبارہ اس کو کسی نے تیل میں ڈبو کر روشن کر دیا ہو۔

اودھ گئے ہر کے رسلین سو بیتے ہیئے دھن آک نئی ہے
تاہ سمے ہر آئی اچانک دیکھت ہی سیرائی گئی ہے
بھور ہی پھیر چلے تن کے اب تو گت ایسی بچارئی ہے
انو مسال بجھی پر کے پھر نیہہ میں بور جرائی دلی ہے

ذیل کے کبت میں جو نائیکا کہتی ہے کہ جب وقت سے پیتم پردیس گئے ہوئے ہیں ایک پل کیلئے بھی خوشی میسر نہیں ہوئی، جدائی کے لمحات قصاب کی طرح جان لینے کے لیے آگے بڑھتے ہیں، ایسی حالت میں درد دل کس سے بیان کیا جائے، اس وقت کام دیو بھی کمان میں تیر چڑھا کر مسلسل حملہ کر رہا ہے، اے راہ گیر تیرا بڑا احسان ہوگا اگر تو نول کشور یعنی کرشن جی سے صرف اتنا جا کر کہہ دے کہ ان کی عدم موجودگی میں جو مظالم مجھ پر ڈھائے جا رہے ہیں انھیں میں کس طرح برداشت کر سکوں گی۔

جب تیں سدھارے پردیس رسلین پیارے تب تیں تنک سا ہیں سکھ کو نہ لہے

برہ کسائی وکھدائی جیو آوے نت میر وہان لین یہ کا سو ہتا کہے

اپنے پر پنچ بان بان میں گہے کمان مارے تک تک بان کیسے کے نبہے

پتھک نہور کہو نول کسو رجو سوں تم بن جو رکون کون سہے

ریتی عہد کے عظیم شاعروں کا سلسلہ رسلین پر ختم ہو جاتا ہے۔

شرنگار کال کے ساتھ سیاسی اور سماجی حیثیت سے ہندوستان کی زندگی میں بہت بڑا انقلاب آ چکا تھا، نئی سیاسی قوتیں پرانے نظام حیات اور قدیم طرز تمدن کی بساط تہہ کر رہی تھیں، ہندی ادب بڑی تیزی کے ساتھ ارتقائی منزلیں طے کر رہا تھا، وہ ایک ایسے دور میں داخل ہو رہا تھا جسے بہت وسیع معنوں میں دور جدید کہا جا سکتا ہے۔

(باقی)

باب التقریظ والانتقاد

سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری

از سید محمد الحسنی، صفحات ۴۰۴، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، قیمت سے؎

جناب مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی

تحریک ندوۃ العلماء کے ایک اہم رکن اور اسکے پہلے ناظم مولانا سید محمد علی مونگیری کی یہ مفصل سوانحعمری ہے، جسے دار العلوم ندوۃ العلماء نے شائع کیا ہے، اس میں مولانا کی ابتدائی زندگی سے لیکر وفات تک کے حالات بڑے شستہ اور شگفتہ انداز میں بیان کیے گئے ہیں، ان کی پاکیزہ زندگی کے واقعات پڑھنے سے آج بھی اللہ کی محبت، اتباع سنت کا جذبہ اور درد مندی اور دلسوزی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، مولانا محمد علی، مولانا فضل رحمن گنج مرادآبادی کے اجل خلفاء اور ہمعصر علماء و صلحاء میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے، انکے ذریعہ ہزاروں آدمیوں کو توبہ و انابت کی سعادت نصیب ہوئی، زہد و اتقاء کے ساتھ وہ ایک وسیع النظر داعی و مفکر اور کامیاب مصنف بھی تھے، انھوں نے چھوٹی بڑی پچاس کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، خاص طور پر رد عیسائیت اور قادیانیت پر انکی کتابیں بہت ہی مقبول ہوئیں، ان ہی خصوصیات کی بنا پر تحریک ندوۃ العلماء کے محرکوں نے جن میں مولانا خود بھی شامل تھے، ان کو اسکا پہلا ناظم مقرر کیا، جس پر وہ عرصہ تک رہے، کئی برس بعد بعض داخلی اور خارجی حالات کی وجہ سے وہ اس سے مستعفی ہو گئے، اسلیے ضرورت تھی کہ مولانا کی ایک مفصل اور پُرمعلومات سوانحعمری شائع کیجاتی، اس کتاب سے یہ ضرورت بدرجۂ اتم پوری ہوگئی، کتاب میں کل سات ابواب ہیں، جن میں مولانا کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، مگر کئی وجوہ سے کتاب کا سب سے زیادہ قابل توجہ اور جاذب نظر تیسرا اور چوتھا باب ہے، خصوصیت کے ساتھ اہل ندوہ کے لیے۔

مولانا کی زندگی اور اسکے مختلف گوشوں کے بارے میں بعض جزئیات کو چھوڑ کر دو رائیں مشکل سے ہو سکتی ہیں، مگر ان دونوں ابواب میں جن مسائل کو چھیڑ دیا گیا ہے، ان سے نہ صرف کتاب کے بارے میں بلکہ ان سے متعلق جو افراد بھی

زیر بحث لائے گئے ہیں، حتیٰ کہ خود مولانا کی ذات کے بارے میں بھی دو باتوں کا ہونا یقینی ہے، ان ابواب میں جن امور پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے اس سے ندوہ کی وسیع النظری اور رواقیت ہی نہیں بلکہ خود مولانا کی سیرت کی افادیت بھی قدرے مجروح ہو جاتی ہے، ان ابواب میں واقعات کو ایک خاص انداز سے ترتیب دے کر تحریک ندوۃ العلماء اور تاریخ دار العلوم ندوۃ العلماء کے سلسلے میں بعض ایسے نئے پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے جو نہ حیات شبلی کے مصنف کے علم میں تھے اور نہ ندوہ کے سالانہ جلسوں کی رودادوں ہی میں ان کا ذکر ملتا ہے، ان ابواب کا مطالعہ کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ مخصوص مزعومات و احساسات کو واقعات کا جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی ہے، ظاہر ہے کہ یہ تاریخ نویسی نہیں بلکہ تاریخ سازی ہے، اس بدعت کی ابتدا انگریزوں نے کی تھی، جسے سیاسی تاریخ نویسوں نے اپنا لیا، اور اب مذہبی حلقے بھی ان ہی نقش قدم پر چل رہے ہیں، تاریخ سازی کی سب سے بڑی خصوصیت مبالغہ آمیزی (خواہ مدح میں یا قدح میں) اور جذباتیت ہوتی ہے جس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس سے حقیقت اور واقعیت مسخ ہو جاتی ہے، خوب، ناخوب اور ناخوب خوب بن جاتا ہے، ادھر ندوہ سے جتنا لٹریچر نکل رہا ہے، اس میں اس طرح کے عناصر کی کارفرمائی بہت نظر آتی ہے، اور اسی کا ایک مظہر اس کتاب کے دو ابواب بھی ہیں،

تحریک ندوۃ العلماء کے کارفرماؤں نے اردو کے افسانوی، صحافتی اور جذباتی تحریریں الندوہ اور دوسرے ذرائع سے جو انقلاب برپا کیا تھا، اس سے علم و ادب اور فکر و نظر کے تمام گوشے متاثر ہوئے تھے، الندوہ کی روش کو چھوڑنا تحریک ندوہ کی علمی حیثیت اور تاریخیت کی طرف سے ایک بدگمانی کی فضا پیدا کرنے کے مترادف ہے، یوں تو ان ابواب میں بہت سی باتیں قابل بحث ہیں لیکن خصوصیت سے دو پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ان ابواب کے مطالعہ کے دوران میں سب سے پہلی بات جو کھٹکتی ہے وہ یہ کہ تحریک ندوۃ العلماء کو ایک مخصوص ذہن کی پیداوار قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے، حالانکہ یہ تحریک کسی ایک ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ ایک اجتماعی احساس و رجحان تھا جو انفرادی طور پر بہت سے دلوں میں پیدا ہوا، اور اس نے مدرسہ فیض عام کے جلسۂ دستار بندی میں ایک اجتماعی شکل اختیار کر لی، سید صاحب حیات شبلی میں مدرسہ فیض عام کے جلسہ میں شریک علماء کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"مشرق و مغرب یہی دونوں مطلع تھے جس سے ندوۃ العلماء کا آفتاب طلوع ہوا۔" (ص ۳۰۲)

پھر آگے لکھتے ہیں: "اس تقریب جلسہ میں یہ طے پایا کہ باہمی مشورہ سے علماء کی ایک مجلس قائم کی جائے۔" (ص ۳۰۳)

پہلی رُوداد میں مولانا محمد علی کے یہ الفاظ موجود ہیں۔

"جب بہت سے نامور علماء مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسہ دستار بندی میں رونق افروز ہوئے اس وقت بعض دوراندیش علماء نے تحریک کی کہ ایک انجمن علماء کی قائم کی جائے، اس تحریک کو تمام علمائے موجودین نے پسند فرمایا۔" (ص ۱)

مولانا خود دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ کسی ایک یا دو چار مخصوص ذہن کی پیداوار نہیں ہے

"ندوۃ العلماء ایسی انجمن نہیں جو کسی ایک شخص کے خیال سے یا دو چار آدمیوں کے مشورہ سے بغیر سمجھے بوجھے قائم کر دی گئی ہو۔" (ص ۱۴)

"بعض دوراندیش" سے ظاہر ہے کہ مولانا نے اپنی ذات تو مراد نہیں لی ہوگی، بلکہ صورت یہ ہوئی کہ موجود علماء میں بعض لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا چونکہ یہ سب کے دل کی آواز تھی اور بہت سے دلوں میں پہلے سے اس کے لیے اضطراب موجود تھا اسلئے اس پر اتفاق ہو گیا، اور وہ مجلس قائم ہو گئی، مولانا محمد علی اس کے صف اول کے موئیدین میں تھے، اس کے بعد مولانا حیدرآباد چلے گئے، پھر دوسرے سال جلسہ دستار بندی کے موقع پر تشریف لائے، اور اسی کے ساتھ ندوہ کا اجلاس بھی کیا، مولانا نے رُوداد میں یہ بھی لکھا ہے کہ بہت دنوں تک واپس آنے کا ارادہ نہیں تھا، مگر مدرسہ فیض عام کے جلسہ کی وجہ سے آنا پڑا۔

اس حصہ کو مصنف کتاب بالکل نظرانداز کر گئے ہیں

اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ یہ تحریک کسی ایک شخص کے جیسا کہ خود مولانا محمد علی نے تحریر فرمایا ہے، ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ بہت سے درد مند اور مضطرب دلوں کی آواز تھی جس نے ایک اجتماعی تحریک کی صورت اختیار کر لی،

مولانا اس کے پہلے ناظم ضرور مقرر ہوئے، مگر اس سلسلہ میں مولانا کا کوئی ایسا انقلابی اور انفرادی کارنامہ نظر نہیں آتا، جس کی وجہ سے ندوہ کا ان کو بانی قرار دیا جائے، اسلئے کہ کسی تحریک یا ادارہ کے بانی کا طرز عمل ایک عام کارکن اور دوسرے کام کرنے والے کا نہیں ہوتا، بلکہ وہ اسکو اوڑھنا بچھونا بنا لیتا ہے، وہ اسکی ساری دلچسپیوں کا مرکز ہوتا ہے، وہ اسی کی خاطر سوتا اور اسی کی خاطر جاگتا ہے، علم و تقویٰ کے تمام امتیازات کے باوجود یہ چیز ہمیں مولانا کی عملی زندگی میں نظر نہیں آتی، اور کتاب میں کوئی واقعی دلیل فراہم کی گئی ہے، بلکہ مولانا کا بار بار استعفیٰ پر اصرار کرنا اس دعویٰ کے خلاف دلیل ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے خط کا جو حوالہ نقل کیا گیا ہے اسکی تردید خود مولانا کے مذکورہ بالا بیان ہی سے ہوتی ہے پھر یہ بات خود قابل بحث ہے کہ کسی تحریک یا ادارہ کا بانی قرار دینے کے لیے اسکے انفرادی کارناموں اور بنیادی لٹریچر کے بجائے دوستوں کے ذاتی خطوط سے دلیل فراہم کیجائے۔

مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ دارالعلوم دیوبند کے بانی نہیں ہیں مگر انھوں نے جب اسکا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا تو بس اسکے ہو رہے، اس سلسلہ میں انھیں بہت کچھ سرد و گرم سہنا پڑا اگر اس کسی آن جدا نہیں ہوئے، اسلیے انھیں بانی قرار دیا گیا، اور یہ بڑی حد تک صحیح بھی ہے، اس میں شبہ نہیں کہ بزرگوں سے کسی ادارہ کی نسبت اس کے اعتماد کی بڑی سند ہے۔ مگر اس کو کسی مخصوص طبقہ کے اعتماد کا ذریعہ بنانے کی کوشش کرنا نفسیاتی کمزوری ہے۔

دوسری بات جو ان ابواب میں پڑھنے والے کو کھلتی ہے وہ یہ ہے کہ کتاب میں قصداً علامہ شبلی کی خدمات کو نظرانداز کرنے اور انکی ذات کو دینی اعتبار سے مجروح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، زہد و اتقاء کے اعتبار سے دونوں میں تفاوت ضرور تھا مگر خود محبت نبویؐ میں چشم ما ستیں ہزار دگوہر اتما شاکن اور خدا کا شکر ہے یہی خاتمہ بالخیر ہوا تھا کہنے والا بھی خدا کے یہاں کچھ کم مرتبہ نہ ہوگا۔ جہاں مولانا محمد علی اور علامہ شبلی کی طبیعتوں میں موازنہ کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں انکے خاندانی اثرات کا ذکر کر کے انکی سیاسیت اور انتہا پسندی کا جو بھیانک نقشہ پیش کیا گیا، اور اس سے جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے وہ نہ صرف غلط ہے بلکہ شائستگی قلم کے بھی منافی ہے، غیرت و حمیت کے نتیجہ میں ان کے دادا کا قبول اسلام اگر ایسا عیب ہے کہ کئی پشت تک اسکا اثر نہیں گیا، تو پھر بعض صحابہ جن میں حضرت حمزہؓ بھی تھے، کے اسلام کے بارے میں کیا رائے قائم کیجائے گی۔

ندوہ کا پہلا اجلاس مدرسہ فیض عام کانپور میں ہوا جسمیں علامہ شبلی نے ایک تماشائی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک فعال اور سرگرم عنصر کی حیثیت سے حصہ لیا، انھوں نے مدرسہ کے اجلاس کی صدارت کی تحریک کی پھر ندوہ کے جلسہ کی تحریک صدارت کی بلکہ روداد کے الفاظ تو یہ ہیں کہ "کارروائی کا کاغذ پڑھکر سنایا" آخر میں ندوۃ العلماء کیلئے دستور کا مسودہ پیش کیا، روداد میں ہے:

"اسکے بعد شمس العلماء مولوی شبلی صاحب نعمانی نے جناب صدر سے اجازت لیکر دستور العمل پیش کیا اور مولوی فتح محمد صاحب نے تائید کی"

اس اجلاس میں نصاب تعلیم کی کمیٹی بنی اس میں ان کا نام موجود ہے، دستور کے مطابق انھی نے مجلس انتظامیہ کی تشکیل کی

تجویز کی تھی، غرض اس اجلاس کے سارے اہم کاموں میں انھوں نے نہ صرف حصہ لیا بلکہ متعدد کام انہی کی وجہ سے انجام پائے، اس اجلاس کی جو رُوداد اس کتاب میں بیان کی گئی ہے، وہ "حیاتِ شبلی" اور ندوہ کی رُوداد سے جو خود مولانا محمد علی مونگیری کی مرتب کردہ ہے مختلف ہے۔ علامہ شبلی کا صرف اتنا ذکر ہے کہ وہ اس جلسہ میں شریک تھے اور اس کی کارروائیوں میں دلچسپی سے حصہ لیتے رہے (ص ۱۲۷) دستور کے سلسلہ میں حیاتِ شبلی اور رُوداد کے بیان کے خلاف لکھا گیا ہے کہ دستور پیش کرنے کا کام مولانا محمد علی نے مولوی عبدالحق حقانی کے سپرد کیا تھا لیکن وہ وقت مقررہ پر تشریف نہ لاسکے چنانچہ مولانا شبلی نے صدر جلسہ کی اجازت سے پیش کیا (ص ۱۲۸) معلوم نہیں کہ ان معلومات کا ذریعہ کیا ہے، پھر مولانا حقانی کا نہ آنا اور علامہ شبلی کا بر وقت دستور پیش کر دینا بالکل سمجھ میں نہیں آتا، اگر مولانا حقانی نے اپنا مسودہ پہلے سے بھیج دیا تھا تو اس کا ذکر روداد میں کیوں موجود نہیں ہے،

مولانا شبلی کو نظر انداز کرنے اور ان کو مجروح کرنے کا جو منصوبہ نوجوان مصنف نے بنایا تھا، اس کی تکمیل کی یہی صورت تھی، کہ ندوہ کے سلسلہ میں ان کی تصویر کا صحیح رخ سامنے نہ آنے پائے۔

ندوہ کی پہلے سال کی رُوداد اور حیاتِ شبلی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جن مقاصد کی تکمیل اور جن علمی، تعلیمی اور معاشرتی تبدیلیوں کے لیے تحریک ندوۃ العلماء کا وجود عمل میں آیا تھا ان میں سے کسی ایک کی تکمیل بھی مولانا محمد علی کے عہد نظامت اور مولانا سید عبدالحی صاحب کی نیابت یعنی ۱۸۹۶ء سے لیکر ۱۹۰۲ء تک نہیں ہوسکی، ان حضرات کے دلوں میں یہ خواہش ضرور تھی جیسا کہ کتاب سے ظاہر ہوتا ہے، مگر ان سب کی تکمیل اور ندوہ کو اس کے علمی و تعلیمی معیار مطلوب سے قریب تر کرنے میں جس نے سب سے زیادہ حصہ لیا وہ علامہ شبلی کی ذات ہے، بلکہ آٹھ برس تک یہ صورت حال تھی کہ ندوہ کا دفتر تک گردش میں رہا، وہ کبھی لکھنؤ میں تھا اور کبھی شاہجہاں پور میں، اور کبھی کسی اور جگہ اس کے لیے امن تلاش کرنے کی کوشش کی گئی، مولانا محمد علی کے سوانح نگار کا بیان ہے کہ

"ندوۃ العلماء کے ماتحت بڑے پیمانہ پر ایک دارالعلوم کے قیام کی تجویز سب سے پہلے مولانا کے ذہن میں آئی اور مولانا نے اس کا ایک واضح خاکہ تیار کر کے ۱۲ محرم ۱۳۱۳ھ کے جلسۂ انتظامیہ میں پیش کیا اور اس کے بعد یہ خاکہ مسودہ "دارالعلوم" کے نام سے شائع کر کے استصواب رائے کے لیے ممتاز علماء، اکابرین اور اہل علم حضرات کو ارسال کیا گیا۔" (صفحہ ۱۴۷)

اس بیان کے مقابلہ میں آپ حیاتِ شبلی کے مصنف کا بیان جو اس تاریخ کے بارہ میں ہے ملاحظہ کیجیے،

"اس سے پہلے ندوہ کے دستور کا ذکر آچکا ہے کہ اسے مولانا شبلی نے پیش کیا، اب نصاب تعلیم کی تبدیلی، دارالعلوم کی تجویز اور دوسرے امور کے

بارے میں سید صاحب کا بیان ملاحظہ ہو۔

"اسکے بعد بارہ علماء کی ایک مجلس ترتیب نصاب کے لیے مقرر ہوگئی، جس میں ایک نام مولانا کا بھی تھا، ان بزرگوں نے رسالے لکھے، اور مولانا نے دارالعلوم کے نصاب کے بجائے دارالعلوم کا مسودہ (خاکہ) تیار کیا، جس کو پڑھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کا مسافر قسطنطنیہ کے کسی بڑے شہر میں کھڑا ہے۔" (حیات شبلی ص ۳۱۰)

سید صاحب آخری جزء میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دارالعلوم کے وسیع تصور کے مطابق اگر اسکا نصاب کوئی تجویز کرسکتا تھا تو وہ مولانا شبلی کی ذات ہے جو عرب، ترکی کی یونیورسٹیوں کا جائزہ لے چکے تھے، اور جنہوں نے حیدرآباد اور دوسرے کئی اداروں کا دینی نصاب تیار کیا تھا۔

مصنف کتاب نے لکھا ہے کہ ۲ محرم ۱۳۱۳ھ کو سب سے پہلے مولانا محمد علی نے دارالعلوم کی تجویز مجلس انتظامیہ میں رکھی، اور سید صاحب کا بیان ہے کہ اس سے دو سال پہلے مولانا شبلی نے دارالعلوم کا خاکہ مرتب کر دیا تھا۔

مجوزہ نصاب کے مطابق ایک الگ دارالعلوم کی تجویز کے بارے میں مصنف کتاب نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ یہ مولانا محمد علی کا پیش کردہ ہے، مگر روداد اور حیات شبلی کے بیان سے اسکی تردید ہوتی ہے، اس سلسلہ میں سید صاحب کا پورا بیان ملاحظہ ہو:-

"۱۰ رجب ۱۳۱۳ھ مطابق دسمبر ۱۸۹۵ء کو کانپور میں نصاب کا جلسہ ہوا .... اور مولانا شبلی نے شرکت کی اور کئی روز کے مباحثہ کے بعد مجوزہ دارالعلوم کے نصاب کا خاکہ مرتب ہوا" (حیات شبلی ص ۳۰۱)

روداد میں مولانا محمد علی اپنے بارے میں لکھتے ہیں: "مجھکو بھی اس میں حاضر ہونے کی عزت حاصل تھی۔" ص ۱۴)

یہی مسودہ ہے جس کو علماء کی مخصوص کمیٹی نے طے کیا تھا جو اجلاس بریلی سے پہلے دوسرے علماء کے یہاں بھیجدیا گیا تھا، اور اس کو پھر اجلاس خاص نے تجویز کی شکل دی، پھر وہ تجویز اجلاس عام میں پیش ہوئی، اس اجلاس کی تفصیل کرتے ہوئے سید صاحب لکھتے ہیں:

"مولانا (شبلی) نے اسکے پہلے ہی اجلاس میں حاضرین کے اصرار سے ندوۃ العلماء کے مقاصد پر ایک تقریر فرمائی، اسی اجلاس کے جلسۂ خاص میں دارالعلوم کی تجویز منظور ہوئی۔"

"دوسرے دن [illegible] شوال ۱۳۱۳ھ مطابق [illegible] اپریل ۱۸۹۶ء کو ندوہ کے اجلاس عام میں مولانا عبدالحق حقانی نے دارالعلوم کی تجویز پیش کی (وہی تجویز جو جلسۂ خاص میں منظور ہوچکی تھی جس کا خاکہ علامہ شبلی نے دو سال پہلے بنایا تھا) اور مولانا شبلی مرحوم نے اسکی تائید کی اور اس سلسلہ میں دارالعلوم کی ضرورت پر ایک تقریر فرمائی جس میں نئے تعلیم یافتہ اور پرانے علماء دونوں کو مخاطب فرماکر اس مجوزہ عربی مدرسہ کی ضرورت بدلائل ثابت کی، یہ بھی طے ہوا کہ مجلس دارالعلوم کے نام سے ایک الگ مجلس قائم کیجائے، اس مجلس کے قواعد مولانا شبلی مرحوم نے تیار کیے اور وہ ارکان کے پاس بھیجے گئے۔" (حیات شبلی [illegible])

ندوہ کے بنیادی مقاصد دو تھے، ایک موجودہ نصاب تعلیم کی تبدیلی، دوسرے نزاع باہمی کا خاتمہ، پہلے مقصد کی تکمیل کا سب سے بڑا ذریعہ ایک درسگاہ کا قیام تھا، اور دوسرے مقصد کی تکمیل کے لیے جدید و قدیم دونوں طبقوں میں اتحاد کی ضرورت تھی، نئی درسگاہ کے قیام کا مقصد محض ایک نئی عربی درسگاہ کا اضافہ نہیں تھا، بلکہ اس میں نئے نصاب تعلیم کے مطابق تعلیم تھی، درسگاہ تو ۱۸۹۸ء میں قائم ہوگئی، مگر اس کے قیام کے آٹھ برس یعنی ۱۹۰۶ء تک اس میں وہی نصاب تعلیم پڑھایا جاتا رہا جو عام درسگاہوں میں پڑھایا جاتا تھا، نصاب میں جدید علوم کے ساتھ انگریزی کا داخلہ بھی پیش نظر تھا جیسا کہ مولانا محمد علی کے سیرت نگار نے لکھا ہے، مولانا بھی اسکے حامی اور موید تھے، مگر تعجب یہ ہے کہ مولانا اور انکے رفقاء کار اپنے عہد نظامت و نیابت یعنی ۱۰ برس کی مدت میں کسی ایک جز میں نہ کوئی تغیر فرما سکے اور نہ کوئی تجویز عملی صورت اختیار کرسکی، مولانا شبلی نے انگریزی کی تجویز کو کئی بار مجلس انتظامیہ اور مجلس عام میں رکھا، وہ منظور ہوئی، مگر اس پر عمل نہ ہوسکا، مولانا شبلی اس کو نافذ کرنا چاہتے تھے لیکن انکو کوئی قانونی پوزیشن حاصل نہیں تھی، اسلیے وہ بار بار ارکان ندوہ کو اسکی طرف توجہ دلاتے تھے، مگر اس وقت جو لوگ دارالعلوم ندوہ میں دخیل تھے وہ اس کیلیے آمادہ نہیں تھے، بلکہ یہ حضرات تو دارالعلوم کی ایک الگ مجلس بھی بنانے کے لیے تیار نہیں تھے، اسی وجہ سے مولانا شبلی کی حرکت انکو اور زیادہ گراں تھی، غرض یہ کہ مولانا شبلی کی آمد سے پہلے تک ندوہ کے قائم کردہ دارالعلوم اور دوسرے عربی مدارس میں کوئی خاص فرق نہیں تھا، علامہ شبلی نے اس کے بارے میں سیکڑوں خطوط دوستوں، بزرگوں اور اپنے خوردوں کو لکھے جو آج بھی مکاتیب شبلی میں موجود ہیں، ایک خط میں مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:-

"کل ایک نقشۂ نصاب جامعہ دارالعلوم ندوہ آیا، اس میں یہ کتابیں ہیں: ملا جلال، شرح جامی، فصول اکبری، میبذی، شافیہ، مکری! ہم آپ خدا کو کیا جواب دیں گے، کیا ندوہ کا یہی مقصود تھا۔"

پھر انھوں نے مولانا شروانی کو دوسرا خط لکھا کہ یہ (یعنی مولانا شبلی نے) اسی کے متعلق درس اول کو لکھا تھا، انکا جواب آیا ہے:

"جدید نصاب ہم لوگوں کو دکھایا تک نہیں گیا۔" (ص ۳۹۳)

جب عربی کتابوں میں تبدیلی کا یہ حال تھا تو انگریزی کے اجراء میں انکو کیا کیا دقتیں نہ اٹھانی پڑی ہونگی، اس کا کچھ اندازہ ان کے خطوط سے ہوتا ہے، دسمبر ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی کو لکھتے ہیں،

"جلسہ انتظامیہ میں باقاعدہ انگریزی داخل کرنے کی تحریک میں نے کی تھی، اور اصرار کیا تھا کہ تحریک درج تحریر کیجائے... لیکن اسکی کیا وجہ ہے کہ کارروائی میں میری تحریک لکھی بھی نہ جائے۔"

اس کے جواب میں مولانا شروانی نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا، تو لکھتے ہیں:

"بات تو کچھ نہیں لیکن مولوی عبدالحی کی بیانہ جوئی اور آپکے خارق العادۃ بھولنے پر تعجب آتا ہے جب میں نے کہا کہ انگریزی کے مسئلہ پر گفتگو نہیں ہوتی تو میں نے کسی قدر سختی سے کہا کہ اس سے کیوں گریز کیا جاتا ہے، آپنے فرمایا کوئی شخص محرک نہیں، میں نے کہا، میں ہوں، اور میرا نام لکھا گیا، مولوی یونس خان نے کہا میں تائید کرتا ہوں۔"

ان کوششوں کے باوجود دو سال تک پھر یہ معاملہ ملتوی رہا، مولانا شبلی نے بار بار اسکی طرف توجہ دلائی، ایک خط میں مولانا شروانی کو دوستانہ انداز میں لکھتے ہیں: "ایک ہمارے روشن خیال مولانا شروانی ہیں ..... انکا حال یہ ہے کہ انگریزی کے نام سے انکو لرزہ آتا ہے بڑی مشکل سے مسلمانوں کو پھسلانے کی تجویز پر راضی ہوئے، تو عمل درآمد میں حیران ہیں۔" (ص ۲۱۴)

غرض یہ کہ عربی نصاب کی طرح جدید علوم اور انگریزی کا اجرا بھی باقاعدہ اس وقت ہوا جب مولانا شبلی ۱۹۰۵ء میں دارالعلوم کے معتمد تعلیم ہو کر آئے، انھوں نے شدید موانع اور رکاوٹوں کے باوجود اس نصاب کو جاری کیا جس کیلئے دارالعلوم قائم کیا گیا تھا۔

اس تفصیل کا مقصود یہ ہے کہ ندوۃ العلماء دارالعلوم کے اجراء کے مقاصد کی تکمیل میں نہ صرف یہ کہ مولانا شبلی کا حصہ دوسرے حضرات سے کم نہیں تھا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ندوے نے جو نمونے بھی پیش کیے اگر ان میں انکی روح کارفرما نہ ہوتی تو اسکو اور اسکے فضلاء کو عام عربی مدرسوں پر کوئی تفوق نہ ہوتا، خصوصیت کے ساتھ دارالعلوم کے معاملات میں تو دوسرے حضرات کا طرز عمل نہ تو ندوے کے مقاصد سے میل کھاتا اور نہ اس میں کوئی ایسی خوبی نظر آتی کہ علامہ شبلی کو ندوہ کی تاریخ میں کوئی درجہ نہ دیا جائے، اور دوسرے حضرات سارے امتیازات کے مستحق گردانے جائیں،

ان دو پہلوؤں کے علاوہ اس کے بعض اور مندرجات اور بعض دوسرے ایسے واقعات ہیں جو قابل بحث ہیں مگر مقصود انکا احاطہ نہیں ہے بلکہ تاریخ سازوں کی ذہنیت کی نشاندہی ہے۔

مطبوعات جدیدہ

علاج خوف و حزن۔ از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب، ضخامت ۴۰ صفحات، کتابت
طباعت عمدہ، ناشر مکتبہ دینیہ، دیوبند، قیمت ۱؎

رنج و غم اور حزن ملال انسانی زندگی کا لازمہ ہیں، اس سے کوئی انسان خالی نہیں ہے، ان سے نجات کی بہت سی صورتیں فلاسفہ حکما، اور نفسیات کے ماہرین نے بتائی ہیں، مگر اس کا ایک علاج توبہ و انابت اور دعا و عبادت بھی ہے، امام غزالی نے صحیح لکھا ہے کہ جس طرح جسمانی امراض کے لیے معالجات ہوتے ہیں، اسی طرح اس روحانی مرض کا عام علاج بھی دعا و عبادت کے ذریعہ کیا جائے تو اس میں کوئی عقلی استبعاد نہیں ہے، اس موضوع پر بہت سے علماء نے کتابیں لکھی ہیں، ان ہی میں امام ابن ابی الدنیا کا رسالہ الفرج بعد الشدۃ بھی ہے، اسی رسالہ کو ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب نے اردو کا جامہ پہنایا ہے، اور جا بجا اپنے مخصوص صوفیانہ انداز میں حواشی لکھے اور اضافے بھی کیے ہیں، اس کتاب کے بعض مندرجات سے اختلاف کی گنجائش ضرور ہے، لیکن مجموعی حیثیت سے یہ کتاب مفید ہے،

روح اسلام اقبال کی نظر میں۔ از ڈاکٹر غلام عمر خاں، صفحات ۱۱۲، کتابت و طباعت
بہتر، ناشر انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز، حیدرآباد، آندھرا۔

علامہ اقبال نے اسلامی تہذیب کے بارہ میں اپنے کلام اور بعض دوسری تصانیف میں جو خیالات ظاہر کیے ہیں ان کی روشنی میں ان کے نقطۂ نظر کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، کتاب میں کل پانچ مباحث ہیں، جس میں بدھ مت، عیسائیت، اسلام، مغرب جدید اور اسلام اور مسلک تصوف

گئے ہیں جو اختلاف ہے، اس کی وضاحت کی گئی ہے، اقبال تصوف کے مخالف نہیں ہیں، مگر انھوں نے رہبانیت اور بدعت کے سلسلہ سے جو اختلاف کیا ہے اس سے بعض لوگ ان کو تصوف کا مخالف سمجھ جاتے ہیں، خود مصنف بھی اس غلط فہمی کا شکار ہیں، ان کے بعض اشعار میں رہبانیت اور تصوف وغیرہ کا جو تقابل اور توافق نظر آتا ہے اس سے وہ تصوف مراد ہے جس کی تمام صوفیائے محققین نے مخالفت کی ہے جس کا پنجاب اور سندھ میں رواج عام ہے، ان جزئیات کو چھوڑ کر کتاب میں اقبال کے نقطۂ نظر سے قریب پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تھوڑی دیر اہل حق کیساتھ ۔ از یونس نگرامی ندوی صفحات ۸۰، کتابت وطباعت بہتر، ناشر مکتبہ طیبہ سی ۲۰ ڈیوڑھی آغا میر، لکھنؤ۔

اس کتابچہ میں بہت سے اہل حق کے سبق آموز واقعات مختلف کتابوں سے جمع کر دیے گئے ہیں، ان میں موضوع کے اعتبار سے کوئی ترتیب نہیں ہے، مگر ان واقعات کو پڑھکر عبرت وبصیرت دونوں پیدا ہوتی ہے، ان ہی بزرگوں کا طفیل ہے کہ دین اپنی اصلی صورت میں آجتک زندہ ہے، یہ کتاب کا دوسرا حصہ ہے پہلا حصہ اس سے پہلے شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہو اگر جواں سال مصنف اس میں کچھ اپنا درد وسوز بھی شامل کر لیتے تو اس کی افادیت میں اور زیادہ اضافہ ہو جاتا۔

صُورِ اسرافیل ۔ از حبیب پالنپوری، صفحات ۲۹۰، کتابت وطباعت عمدہ، پتہ ادارہ اشاعت دینیات، نظام الدین اولیاء، نئی دہلی ۱۳، قیمت ۳ روپے

یہ ایک گجراتی شاعر حبیب پالنپوری کا مجموعۂ کلام ہے جسمیں غزلیں اور نظمیں دونوں ہیں، غالبؔ پہلی بار ان کا مجموعۂ کلام سامنے آیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان پر قدرت نے شاعری کی تمام صلاحیتیں جمع کر دی ہیں، انکے کلام میں علامہ اقبال کے ذوق حکیمانہ اور جذب عاشقانہ کی جھلک ملتی ہے، امید ہے کہ یہ مجموعہ اہل ذوق میں ذوق وشوق سے پڑھا جائے گا۔

م، ع

سلسلۂ تاریخ ہند

دارالمصنفین کے تین اہم اور مقبول ترین سلسلۂ تصنیفات یعنی سیرۃ النبی، سیر الصحابہ اور تاریخ اسلام کے علاوہ ایک اہم سلسلۂ تاریخ ہند کا بھی ہے جس میں اب تک حسب ذیل کتابیں شائع ہو کر ملک و قوم سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں،

کتاب	صفحات	قیمت
مقدمۂ رقعات عالمگیر	۲۹۲ صفحے	قیمت: [illegible]
مختصر تاریخ ہند	۳۰۸ ״	״ سے ر
تاریخ سندھ	۴۰۸ ״	״ [illegible]
بزم تیموریہ	۴۷۸ ״	״ [illegible]
بزم مملوکیہ	۲۹۴ ״	״ [illegible]
بزم صوفیہ	۵۳۸ ״	״ [illegible]

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک
ایک جھلک

۵۲۴ صفحے قیمت: [illegible]

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام

۵۰۰ صفحے قیمت: [illegible]

ہندوستان عربوں کی نظر میں

حصہ اول ۴۰۰ صفحے قیمت: [illegible]

حصہ دوم ۴۰۹ صفحے ״ [illegible]

گجرات کی تمدنی تاریخ مسلمان حکمرانوں کے
عہد میں

ضخامت ۳۲۹ صفحے قیمت: [illegible]

"ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے
عہد کے تمدنی جلوے"

اس میں سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کے عہد کے
تہذیب و تمدن کی پوری تصویر آگئی ہے،

۶۵۰ صفحے قیمت: [illegible]

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد
کے تمدنی کارنامے

اس میں مختلف اہل قلم مصنفین کے قلم سے اس عہد
کے تمدنی و علمی کارناموں کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

۲۵۴ صفحے قیمت [illegible]

ہندوستان کی کہانی ۸۰ صفحے قیمت [illegible]

"منیجر"

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰)

دسمبر سنہ ۱۹۶۵ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سلسلۂ تاریخ اسلام

دارالمصنفین اس وقت تک مختلف علوم و فنون پر ۳۴ و کتابیں شائع کر چکا ہے، ان میں ایک اہم سلسلہ تاریخ اسلام کا بھی ہے جو بہت مقبول ہے، یہ عربی مدارس کے منتہی طلبہ کی مطالعہ کی کتابوں کے علاوہ ہند و پاک کی مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نصاب میں بھی شامل ہے، اس کی چار جلدیں بتفصیل ذیل شائع ہو چکی ہیں،

تاریخ اسلام حصہ اول

(عہد رسالت و خلافتِ راشدہ) قیمت ۴ روپے

تاریخ اسلام حصہ دوم

(بنی امیہ دمشق)

قیمت: ۴ روپے

تاریخ اسلام حصہ دوم

(خلافتِ عباسیہ کی تاریخ سفاح سے متقی باللہ تک) قیمت ۶ روپے

تاریخ اسلام حصہ چہارم

مستعصم باللہ تک خلافتِ عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی تاریخ اور اس کے تمدنی کارنامے) قیمت ۶ روپے

مؤلفہ شاہ معین الدین احمد ندوی

"منیجر"

جلد ۹۶ ماہ شعبان المعظم ۱۳۸۵ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۶۵ء عدد ۶

مضامین

شذرات

گذشتہ دو مہینوں میں مسلمانوں کے دو بڑے قومی حادثے ہوئے، ۵ نومبر کو داؤدی بوہروں کے امام ملا طاہر سیف الدین نے انتقال کیا، ان کی ذات جامع صفات تھی، بڑے ذی علم، دیندار، فیاض و مخیر اور وسیع القلب تھے، دینی علوم پر انکی نگاہ بہت وسیع تھی، اس لحاظ سے وہ ہندوستان کے ممتاز علماء میں تھے، صاحب قلم بھی تھے، عربی میں انکی کئی تصانیف ہیں، انھوں نے اپنے دور میں نہ صرف اپنے فرقہ کی بڑی تعلیمی و اقتصادی خدمت کی بلکہ دوسرے اسلامی فرقوں کے ساتھ بھی انکا سلوک روادارانہ اور فیاضانہ تھا اور ان کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کی، مسلم یونیورسٹی کے تو چانسلر ہی تھے، اس کو وقتاً فوقتاً بڑی بڑی رقمیں دیتے رہتے تھے، دار المصنفین کی جوبلی کے موقع پر اس کو بارہ ہزار کا عطیہ دیا، اس لیے ہر فرقہ کے مسلمانوں میں عزت و وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کے حسنات کے طفیل میں انکی مغفرت فرمائے، دار المصنفین اس حادثہ میں ان کے لائق جانشین ملا برہان الدین کا شریک غم ہے اور دعا ہے کہ خدا ان کو ان کے باعظمت والد کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

دوسرا حادثہ مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی کی وفات کا ہے، مرحوم مولانا سید محمد انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ کے شاگرد رشید اور ہندوستان کے ممتاز عالم تھے، انکی پوری زندگی دینی علوم خصوصاً حدیث نبوی کی خدمت، اس کی تعلیم و تدریس اور اس سے متعلق تالیف و تصنیف میں گذری، مختلف اوقات میں دار العلوم دیوبند اور مدرسۂ ڈابھیل کے مدرس رہے، کچھ دنوں تک ندوۃ المصنفین سے بھی تعلق رہا، پھر ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے، وہاں بھی درس و افاضہ کا سلسلہ جاری رہا، چند برسوں کے بعد دیار حبیب کی کشش مدینہ طیبہ کھینچ لے گئی اور دس بارہ سال تک جوار رسول میں حدیث رسول کی خدمت انجام دیتے رہے اور بالآخر اسی آستانہ پر گذشتہ اکتوبر میں جان دی، سلوک و تصوف کا بھی وافر حصہ ملا تھا، ان کے دو بڑے علمی و دینی کارنامے ہیں، مولانا انور شاہؒ کے درس بخاری کی تقریروں کی جمع و تدوین جو فیض الباری کے

نام سے مصر سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔ اردو میں ترجمان السنۃ کی ضخیم جلدیں جو ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی ہیں۔ ان کی وفات سے ایک بڑی علمی و دینی شخصیت اٹھ گئی، اللہ تعالیٰ صاحب حدیث صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں حدیث و سنت کے اس خدمت گذار کی مغفرت فرمائے۔

بعض حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہر زمانہ میں یکساں قائم رہتی ہیں، زمانہ کے تغیرات کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا، انہی میں "الناس علی دین ملوکھم" بھی ہے، اس مقولہ میں دین سے مراد مذہب نہیں بلکہ خیالات و رجحانات اور طریقۂ زندگی ہے، البتہ اس زمانہ کے لحاظ سے ملوک کے بجائے حکومت کہا جائے گا۔ طریقۂ زندگی میں ایک اثر پذیری تو فطری ہے، جب دو قومیں یا دو تہذیبیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں تو ان کا دوسرے سے متاثر ہونا طبعی اور ناگزیر ہے، جس طرح ایک زمانہ میں ہندو مسلمان ایک دوسرے کی تہذیب سے متاثر ہوئے لیکن یہ دونوں تہذیبوں کا حسین اور فطری امتزاج تھا، دوسرا تاثر مرعوبیت، احساس کمتری، حکومت سے تقرب، اس کی خوشنودی اور منصب و جاہ کی طلب کا نتیجہ ہوتا ہے، اس کی مثال انگریزوں کے زمانہ کے "دیسی صاحب" اور حکومت کے مقرب و خطاب یافتہ ہندو مسلمان تھے، ہندو مسلمان فطری طور پر ایک دوسرے کی تہذیب سے جتنا متاثر ہونا تھا، ایک ہزار سال میں ہو چکے، اب مسلمانوں کی مزید اثر پذیری، ان کی مرعوبیت، احساس کمتری، حکومت سے تقرب، اس کی خوشنودی اور منصب جاہ کی طلب کا نتیجہ ہے، یہ اثر پذیری ان مسلمانوں میں زیادہ ہے جو حکومت سے وابستہ اور اس کے فوائد اور مناصب کے طالب ہیں، اس کی مثالیں دینے کی ضرورت نہیں، اس کا اندازہ ہر شخص کو ہوگا۔

یہاں تک بھی غنیمت تھا، اس سے بھی بڑھ کر مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو اپنا سیکولرازم اور حکومت و اکثریت کی وفاداری کے ثبوت اور ان کی خوشنودی کے جنون میں ایسی ایسی خفیف حرکتیں کرتا ہے جس کا کوئی خود دار انسان تصور نہیں کر سکتا، اسلام اور مسلمانوں کی نسبت سے گھبراتا ہے، سیکولرازم کے پردہ میں اسلامی تہذیب و روایات کی مخالفت کرتا ہے، مسلمانوں کو فرقہ پرستی کا مجرم بناتا ہے، ان کے خلاف جاسوسی تک کرتا ہے، اس کی نگاہ میں پرانے نیشنلسٹ مسلمان بھی جن میں

قوم پروری کے ساتھ ملی احساس بھی ہے، فرقہ پرور ہیں، چنانچہ وہ ان کرزینشلسٹ مسلمانوں کو بھی جو کسی فرقہ وارانہ یا اسلامی جذبہ کے ماتحت نہیں بلکہ خالص جمہوری اور سکولر نقطۂ نظر سے مسلمانوں کے ساتھ بھی انصاف چاہتے ہیں، نہیں بخشتا، کسی کی زبان پر مسلمان کا نام آیا اور اس نے فرقہ پروری کا لیبل لگا دیا، اور پاکستانی ایجنٹ کا خطاب دیدیا، ایک خالص اور پرانے نیشنلسٹ اخبار تک کو ان صاف الفاظ میں اس کا اعتراف کرنا پڑا۔

"بعض سیاسی جماعتوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ مسلمانوں نے جہاں کوئی مطالبہ ایسا کیا جس کا تعلق صرف مسلمان فرقے سے ہو، وہ جماعتیں شور مچانے لگتی ہیں کہ مطالبہ اپنی اسپرٹ میں پاکستانی ہے، اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان ہندوستان کے ساتھ نہیں ہیں، پاکستان کے ساتھ ہیں، خیر یہ تو فرقہ پرور جماعتیں ایسا کہیں تو کہیں، ان کا تو کام ہی یہ ہے، لیکن افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں میں بھی ایک گروہ ایسا ہے جو ہندو فرقہ پرور جماعتوں کی تحریکوں اور پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر مسلمانوں کی ان باتوں کو انہی کی نظروں سے دیکھنے لگتا ہے۔" (قومی آواز ۹ر نومبر ۱۹۶۵ء)

معزز معاصر نے مسلمانوں کے اس نو پیدا طبقہ کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل صحیح ہے، لیکن اس کا جو سبب بتایا ہے وہ محض اس کی احتیاط ہے، ورنہ اس کا اصلی سبب وہ بھی جانتا ہے، درحقیقت یہ سب "الناس علیٰ دین ملوکھم" کا نتیجہ ہے، اور سیکولرازم کے نام پر کیا جاتا ہے، اس لیے اگر ایسے مسلمانوں کو حکومت اور اکثریت کا خوشامدی نہ سمجھا جائے تو کیا سمجھا جائے، محض سیکولرازم پر عقیدہ رکھنے والے مسلمان اس میں شامل نہیں ہیں، لیکن حقیقۃً یہ جمہوریت اور سیکولرازم کی کوئی خدمت نہیں ہے، صحیح جمہوریت اور سیکولرازم یہ ہے کہ ہر فرقہ کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے، اس کی خصوصیات کے ساتھ اس کو زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا موقع دیا جائے، سب کو ایک رنگ میں رنگنے کی کوشش سیکولرازم اور جمہوریت نہیں بلکہ استبداد کی بدترین قسم ہے، اس لیے جو لوگ ایسا کرتے ہیں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان سیکولرازم اور جمہوریت کے دشمن ہیں، ممکن ہے ان سیکولر مسلمانوں کو حکومت سے کچھ فوائد حاصل ہو جائیں لیکن عملی نگاہ میں ان کی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی، اور نہ وہ اکثریت کا اعتماد حاصل کر سکتے ہیں۔

مقالات

عالمگیر اور اس کے معاصر مشائخ

از جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ایم اے

شاہ جہاں[*] نے اپنے عہد میں دین اور مذہب کی ترویج کر کے اپنی سلطنت میں اسلامی فضا قائم کرنے کی کوشش کی جس کی بین شہادتیں دہلی کی جامع مسجد، آگرہ کی موتی مسجد، اور اسکی بنائی ہوئی دوسری مسجدیں ہیں، اس نے اپنے شہزادوں کو بھی پوری مذہبی تعلیم دلائی، دارا شکوہ، شجاع، اورنگ زیب اور مراد، سب ہی اپنے زمانہ کے جید علماء و فضلاء سے تعلیم پاتے رہے، ان میں اورنگ زیب نے معقولات و منقولات کی تعلیم میر محمد ہاشم سے پائی۔[۱] کلام پاک کا درس ملا موہن (ساکن بہار شریف) سے لیا،[۲] امام غزالی کی اکثر کتابیں خصوصاً احیاء العلوم مولانا سید محمد قنوجی سے پڑھیں[۳] تفسیر کا درس ملا جیون سے لیتا رہا،[۴] فقہی جزئیات کو شیخ عبد القوی برہان پوری سے سمجھا،[۵] ملا شفیعائی دانشمند خاں سے بادشاہت کے زمانہ میں بھی خاص خاص کتابیں پڑھا کرتا تھا، اس کو دینی علوم سے فطری رغبت تھی،

---

* اپریل ۱۹۶۵ء میں یوم عالمگیر کراچی میں منایا گیا، یہ مقالہ اسی موقع کے لیے جناب ڈاکٹر معین الحق جنرل سکریٹری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی فرمایش پر لکھا گیا۔

۱ بادشاہ نامہ از عبد الحمید لاہوری ج ۱ ص ۲۰، ۲ مآثر الکرام ص ۲۴۳ ۳ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۔
۴ مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۶ ۵ مآثر الامراء ج ۱ ص ۲۲۶-۲۲۵

لائق اور فاضل اساتذہ کی نگرانی میں ان علوم سے اس کا شغف اور بھی زیادہ بڑھ گیا۔ امام غزالی کی تصانیف، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات اور شیخ محی الدین شیرازی کے رسائل اس کے مطالعہ میں برابر رہے۔[1]

اس نے کلام پاک حفظ کیا تو قرآنی علوم سے بھی اس کی دلچسپی بڑھی، بادشاہت کے زمانے میں جب فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کا کام شروع کرایا تو اس کو شیخ نظام برہان پوری، ملا محمد جمیل جونپوری، قاضی محمد حسین جونپوری، ملا حامد جونپوری، شیخ وجیہ الدین گوپاموی، شیخ رضی الدین بھاگلپوری، قاضی سید عنایت اللہ مونگیری، سید نظام الدین ٹھٹھوی اور ملا غلام محمد لاہوری وغیرہ جیسے علماء اور فقہاء کی صحبت رہی جس کی وجہ سے وہ اور بھی حامیِ دین اور پابند شریعت ہوتا گیا، اسی لیے وہ شروع ہی سے ایسے مشائخ کا بھی قدردان رہا جو ہر حال میں شریعت اور اسلامی شعار کے پابند تھے۔

جب وہ دکن کا صوبیدار تھا، تو اس زمانہ میں حضرت عبداللطیف برہانپوری ایک مشہور بزرگ تھے، شریعت کے بڑے پابند ہونے کی وجہ سے نغمہ و سرود و غنا اور آلۂ غنا کو ناپسند کرتے تھے، شادی بیاہ کے موقع پر کوئی جلوس ان کی خانقاہ کے پاس باجا گاجا لے کر نہیں گذر سکتا تھا، دوسرے بزرگ ان کے متعلق کہتے کہ ہم کو شکر گذار ہونا چاہیے کہ ایسے متشرع اور حق پرست بزرگ ہم میں موجود ہیں، اورنگ زیب ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، ایک بار اس نے ان کی خدمت میں خانقاہ کے مصارف کے لیے کچھ گاؤں پیش کرنا چاہا، تو انھوں نے یہ شعر پڑھ کر لینے سے انکار کیا۔

شاہ ارادہ دہد منت نہد رازق ما رزق بے منت دہد

اورنگ زیب اس شعر کو سن کر متاثر ہوا، لیکن اس نے عرض کیا کہ ہم فقراء اور اولیاء اللہ کی خدمت خیر دنیوی اور برکت اخروی کے لیے کرتے ہیں، گاؤں پیش کر کے احسان کرنا مقصود نہیں، حضرت عبداللطیف نے فرمایا کہ اگر خیر و برکت حاصل کرنا ہے تو رعایا سے نصف غلہ لو، اور ملکہ جنت کشور

[1] آثر عالمگیری ص ۳۸۸ اردو

اور مظلوموں کے پاس اور بھی زیادہ چھوڑ دو، گوشہ نشینوں اور متوکلوں کے لیے وظائف مقرر کرو، مظلوموں کی داد رسی اس طرح کرو کہ ان کی حق تلفی نہ ہو اور ظالموں کے ہاتھ مظلوموں کے قبضے کوتاہ ہوجائیں وغیرہ، اورنگ زیب نے ان باتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیا، اور اس نصیحت پر عمل کرنے کی کوشش کی، جیسا کہ اس نے اپنے ایک رقعہ میں اس کا ذکر کیا ہے[1]

اورنگ زیب کو ان کے آخر وقت تک ان سے عقیدت رہی، منتخب اللباب میں ہے:

"خلد مکاں را در خدمت ایشاں ارادت و حسن عقیدت تمام بود، و ہیچ ماہ و ہفتہ نہ بود کہ فرمان لطف آمیز بہ دستخط خاص بنام ایشاں صادر نشود" (ج ۲ ص ۵۶۹)

شیخ عبد اللطیف برہانپوری کے ایک خاص مرید ملا قطب ہانسی ملتان کے رہنے والے تھے، وہ اورنگ زیب کی شہزادگی کے زمانہ میں برہانپور میں اس سے ملے تھے، تو اورنگ زیب اسی وقت سے ان کا قدر دان ہوگیا، اور جب وہ بادشاہ بنا تو اس نے ملا صاحب کی خدمت میں چار لاکھ درہم پیش کیے اور ایک گاؤں بھی ان کے نام سے موسوم کیا، جس کا نام قطب آباد رکھا گیا[2]

برہان پور میں ایک دوسرے بزرگ شیخ برہان تھے، جو مریدوں کی تربیت کرنے میں بہت سختی کرتے تھے، ان کی خانقاہ میں کچھ ایسے مرید بھی جمع ہوجاتے جو ان کے عقیدت و محبت میں عالم سکر میں ان کو خدا کہہ دیتے، شیخ برہان اس کو پسند نہ کرتے، اور جب وہ باز نہ آتے تو ان کو سزا کے طور پر قید کردیتے، اگر ان کے مریدین شریعت کی خلاف ورزی کرتے اور ان کی نصیحت قبول نہ کرتے تو ان کو شہر کے قاضی کے حوالے کردیتے، جو ان کو قید کردیتا، پھر بھی وہ باز نہ آتے تو قاضی ان کو قتل کردیتا،

---

[1] رقعات عالمگیری شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڈھ، نمبر ۲۲، مقدمہ رقعات عالمگیر ص ۱۳۲، منتخب اللباب از خافی خان حصہ دوم ص ۵۶ - ۵۵۵، بزم تیموریہ ص ۲۵۳ [2] مراۃ العالم قلمی نسخہ دار المصنفین ورق ۳۰۱، بزم تیموریہ ص ۲۴۵

اورنگ زیب جنگ جانشینی کے لیے دکن سے روانہ ہوا تو وہ حضرت شیخ برہان کی خدمت میں بہ بانفسِ خود حاضر ہوا۔ شیخ برہان ہندو مسلمان سے بے تکلف ملا کرتے تھے۔ ان کے لیے ان کی خانقاہ کا دروازہ کھلا رہتا لیکن وہ بادشاہ اور امراء سے ملنا اپنے مسلک کے خلاف سمجھتے تھے۔ اس لیے اورنگ زیب بھیس بدل کر ان کی مجلس میں شریک ہوا۔ ایک نو وارد کو دیکھ شیخ برہان نے نام پوچھا، اورنگ زیب نے جب اپنا نام بتایا تو وہ اس کی طرف مخاطب نہیں ہوئے۔ اور جب عام لوگوں کو تبرک دینے لگے تو اورنگ زیب کو کچھ نہ دیا لیکن اورنگ زیب اس سے بد دل نہ ہوا۔ دوسرے دن پھر ان کی خانقاہ میں پہنچا۔ شیخ برہان نے اپنی آزردگی کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہا کہ یہ مکان تم کو پسند ہے تو لے لو، ہم کہیں اور جگہ چلے جائیں گے۔ اورنگ زیب اس سے بھی دل گیر نہ ہوا تیسرے دن پھر وہ ان کے پاس گیا۔ شیخ برہان نماز کے لیے خانقاہ سے باہر نکل رہے تھے کہ اورنگ زیب مؤدبانہ ان کے سامنے کھڑا ہو گیا، اور عرض کی کہ دارا نے شریعت کو نظر انداز کر رکھا ہے، اگر مجھکو حکومت ملی تو دین نبوی کے احکام کے ساتھ رعیت پروری بھی کرونگا، آپ باطنی توجہ فرمائیں، یہ سن کر شیخ برہان نے فوراً کہا کہ ہمارے جیسے کم اعتبار فقیروں کی دعا سے کیا ہوتا ہے تم بادشاہ ہو، نیکی، عدل پروری، اور رعیت نوازی کی نیت کے ساتھ دعا کرو، ہم بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں، اسی وقت اورنگ زیب کے ساتھی شیخ نظام نے اس سے کہا بادشاہی مبارک ہو۔[1]

اور جب عالمگیر تخت نشین ہوا تو اس کو اپنی شریعت نوازی کے سبب قدم قدم پر ابتلاء و آزمائش کا سامنا کرنا پڑا، ان ہی میں دارا شکوہ اور حضرت سرمد کے قتل و شہادت کے بھی واقعات ہیں، یہاں پر حضرت سرمد کے ساتھ دارا شکوہ کا نام اس لیے لیا گیا ہے کہ وہ بھی بوقت سخ ہو گیا تھا، کیونکہ اس کے مرشد ملا جیو اپنے مریدوں کو اسی کی صورت کا مراقبہ کرنے کی تلقین کرتے تھے۔

---

[1] منتخب اللباب جلد دوم ص ۵۵۴، نیز دیکھو بزم تیموریہ ص ۲۷۴

اور وہ ان سے کہتے تھے کہ اگر تم اس کی طرف متوجہ ہو گے تو خدا سے پھر جاؤ گے (حسنات العارفین از دارا شکوہ ص ۴۲)۔ اور وہ خود بھی اپنی تصنیف سکینۃ الاولیا میں لکھتا ہے، جہاں اور کوئی طالب سالہا سال کے مجاہدوں اور ریاضتوں سے پہنچتا ہے، میں بغیر ریاضت کے یکبارگی پہنچ گیا، اور جو میں چاہتا تھا وہ مجھے مل گیا (ص ۵)، پھر اس کی زبان سے کچھ ایسے کلمات نکلنے لگے جن کو سنکر علماء آزردہ خاطر ہوئے، لیکن وہ خود اپنی مدافعت میں حسنات العارفین کی تمہید میں لکھتا ہے کہ توحید و معرفت کے منازل و مدارج میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے، جب ایک سالک شریعت و طریقت کفر و ایمان، خیر و شر اور عبد و معبود سے بالکل بے نیاز ہو جاتا ہے، اور بیخودی میں اسکی زبان سے ایسے کلمات نکلتے ہیں جو بظاہر مذہب و ایمان کے منافی ہوتے ہیں، لیکن وہ قابل مواخذہ نہیں (دیکھو تمہید حسنات العارفین از دارا شکوہ) لیکن دارا شکوہ کی اس تاویل سے علمائے ظواہر مطمئن نہیں تھے، پھر اس نے مجمع البحرین لکھ کر اسلام اور ہندو مذہب کو ایک ہی سمندر کے دو دھارے بتائے اور ان دونوں کو ملانے کی کوشش کی، اور یہ بھی بتایا کہ اسلامی تصوف اور ویدانت میں لفظی اختلاف کے سوا کوئی اور فرق نہیں، توحید کے شیدائی ان دونوں میں سے جس کی بھی تقلید کریں حقانیت کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں، علمائے ظواہر نے دارا شکوہ کے ان خیالات کو مطلق پسند نہیں کیا، اور جب اس نے اپنشد کا مطالعہ شروع کیا تو اس کی تمہید میں اس کا بیان ہے کہ اس کو علم توحید توریت، انجیل اور زبور کے مطالعہ سے حاصل نہ ہو سکا، کیونکہ ان میں توحید کا بیان مجمل ہے، وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اس کی تسلی قرآن پاک سے بھی نہ ہو سکی، کیونکہ اس کی اکثر باتیں رمز کی ہیں، آخر اس کو توحید کی تمام باتیں اپنشد میں مل گئیں جس کے پچاس ابواب کا ترجمہ اس نے سنسکرت سے فارسی میں کرکے عام کیا، وہ رفتہ رفتہ توحید وجودی کا قائل ہو کر بھگوت گیتا، بشسٹ اور رام چندر جی کا بھی معترف ہو گیا، اور ویدو دھرم کی تفریق مٹانی چاہی جو ظاہر ہے کہ

اسلام کے راسخ العقیدہ علما، وفقہا، اور صوفیہ کو پسند نہ آیا، عالمگیر نے جب دعوا وت اور سموگڑھ کے محاذ پر دارا کو شکست دیدی تو پھر اس کو شریعت کے محاذ پر لاکر اس کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں کیا رکاوٹ پیدا ہو سکتی تھی، جبکہ راسخ العقیدہ علما، اور فقہا، اس کو مرتد اور ملحد سمجھتے تھے۔ آجکل کے مورخین کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اس کی رواداری اور وسیع المشربی سے متاثر ہے اور یہ کہتا ہے کہ اگر داراشکوہ تخت نشین ہوتا تو مسلمانوں کی حکومت برابر قائم رہتی، لیکن اورنگ زیب کے حامی یہ کہتے ہیں کہ داراشکوہ کے تخت نشین ہونے سے مسلمانوں کی حکومت تو باقی رہتی لیکن اسلام باقی نہ رہتا۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی سے اس کے بعد گو مسلمانوں کی حکومت کچھ دنوں کے بعد باقی نہیں رہی لیکن ہندوستان میں اسلام باقی رہا،

حضرت سرمد کا معاملہ داراشکوہ سے کچھ مختلف تھا، وہ بھی داراشکوہ کی طرح ایسی ہی توحید وجودی کے قائل تھے جس کو علما، اور شریعت نواز صوفیہ پسند نہ کرتے تھے، وہ داراشکوہ کے حامی رہے، انھوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ شاہجہاں کے بعد وہی بادشاہ ہوگا، لیکن جب وہ پسپا ہو کر قتل کر دیا گیا تو عالمگیر نے حضرت سرمد سے دریافت کیا کہ انھوں نے داراشکوہ کو بادشاہت کی جو خوشخبری دی تھی وہ کیسے پوری نہ ہو سکی حضرت سرمد نے جواب دیا کہ وہ مژدہ صحیح نکلا کیونکہ داراشکوہ کو ابدی سلطنت کی تاجپوشی نصیب ہوئی، ظاہر ہے کہ یہ تاویل اورنگزیب کو ناگوار گزری ہوگی لیکن ان پر اور بھی الزامات تھے، کہ وہ معراج جسمانی کے منکر ہیں، اور برہنہ رہا کرتے ہیں، حکومت کے قاضی عبدالقوی نے ان سے باز پرس کی تو انھوں نے جواب دیا کہ شیطان قوی است۔ اس کو قاضی عبدالقوی اپنے اوپر طنز سمجھے، انھوں نے ان پر عریانی کا جرم قائم کر کے عالمگیر کو ان کے قتل کا مشورہ دیا لیکن عالمگیر نے اس کو یہ کہکر رد کیا کہ صرف عریانی وجہ قتل نہیں ہو سکتی، ان کے متعلق یہ بھی مشہور تھا کہ وہ کلمہ کا صرف ایک جز یعنی لا الٰہ

پڑھتے ہیں، اس امتحان کے لیے شاہی دربار میں علماء کا اجتماع ہوا جس میں حضرت سرمد بھی طلب کیے گئے، ان سے کلمہ پڑھنے کے لیے کہا گیا، تو انھوں نے حسب عادت صرف ایک جز یعنی لاالہٰ پڑھا، علما نے اس پر اعتراض کیا تو انھوں نے کہا میں ابھی نفی میں مستغرق ہوں، مرتبۂ اثبات پر نہیں پہنچا ہوں، تو پھر جھوٹ کیسے کہوں، علماء نے کہا، ایسا کہنا کفر ہے، اگر کہنے والا توبہ نہ کرے تو واجب القتل ہے، اور ان کے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا گیا۔ حضرت سرمد کی قبر اب بھی مرجع خواص و عوام ہے، انھوں نے محبت الٰہی، دیدار الٰہی اور دیدار نبوی پر جو رباعیاں کہی ہیں وہ آج بھی ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں، لیکن وہ ترک شریعت کی وجہ سے قانون شریعت کی زد میں آگئے،

دارا شکوہ اور حضرت سرمد کے قتل و شہادت میں مورخین سیاسی مصالح بھی شامل کرتے ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہو کہ اسی زمانہ میں توحید وجودی کی جو موشگافیاں ہوئیں، ان سے طرح طرح کے فتنے اٹھتے گئے جس کی آڑ میں شرعی احکام سے مداہنت اور اغماض کیا جانے لگا، شریعت کو حقیقت کا چھلکا بتایا گیا، انا الحق کا نعرہ بلند ہونے لگا جسینوں کی صحبت میں رسائی حق کی راہ تلاش کی جانے لگی، سادہ رخوں میں اللہ ہی کا رنگ دیکھا جانے لگا جسینوں کے غمزوں اور عشوہ و ں سے کو ... مجازی عشق سے حقیقی عشق تک پہنچنے کا ذریعہ قرار دیا جانے لگا، راسخ العقیدہ صوفیہ ان تمام باتوں کو بدعت، گمراہی اور ضلالت قرار دیتے، وہ صرف لاالہٰ الا اللہ کہنے والے کو مسلمان سمجھنے کے لیے تیار نہ تھے، جب تک کہ وہ محمد رسول اللہ بھی کہنے کے قائل نہ ہوتے، وہ توحید اور رسالت دونوں پر یقین کامل رکھنے ہی میں عقیدہ اور ایمان کی سلامتی سمجھتے اور کہتے کہ صوری اور معنوی اخلاق کی درستگی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل متابعت نہ ہو، اس متابعت کے ذریعہ سے اللہ تبارک و تعالیٰ

کی قربت حاصل ہونا ممکن ہے، وہ انا الحق کے کہنے والوں کو مرتد اور بے دین سمجھتے، اسی لیے ان کے خلاف ہنگامہ کرتے اور سلاطین وقت سے مل کر ان کو قتل کرا دیتے۔

توحید کے اس قسم کے پرستاروں کے خلاف حضرت مجدد الف ثانی نے جو آواز اٹھائی تھی، وہ برابر گونجتی رہی، خود ان کے صاحبزادے حضرت خواجہ معصوم سرہندی جو ان کے علوم و معارف کے بہت بڑے شارح تھے، بلکہ ان کے نقش قدم پر چل کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تلقین کر کے مسلمانوں کی مذہبی زندگی کی تجدید اور اصلاح میں لگے تھے۔ ان کی تعلیم تھی کہ سنت کا اتباع اور بدعت سے اجتناب کرنا ہر حال میں دامن متابعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تھامنا اور آثار صحابہ پر چلنا ضروری ہے، اور اپنے تمام مریدوں اور متوسلوں کے خطوط میں اسی کی تربیت دیتے رہے، مثلاً اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"اے بھائی! ناجنس اور مخالف طریق کی صحبت سے بچتے رہنا، اور بدعتی کی مجلس سے گریزاں رہنا، یحییٰ معاذ رازی قدس سرہٗ کا مقولہ ہے کہ ان تین اصناف سے اجتناب کرو، (۱) علمائے غافلین (۲) قرائے مداہنین (۳) متصوفہ جاہلین۔ جو شخص شیوخت کی مسند پر بیٹھا ہوا ہے اور اس کا عمل موافق سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہے، اور نہ وہ خود زیور شریعت سے آراستہ ہے، خبردار، خبردار اس سے دور رہنا، بلکہ احتیاطاً اس شہر میں بھی نہ رہنا ...... سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی قدس سرہٗ فرماتے ہیں، کامیابی کے تمام راستے بند ہیں، سوائے اس شخص کے راستے کے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نشان قدم کی پیروی کرے ...... آداب نبوی کا خیال نہ رکھنے والے اور سنن مصطفوی کو چھوڑ دینے والے کو ہرگز ہرگز عارف خیال نہ کرنا، اس کے ظاہری تبتل وانقطاع خوارق عادات

زہد و توکل اور زبانی معارف توحیدی پر فریفتہ و شیفتہ نہ ہو جانا......... مدارکار اتباع شریعت پر ہے، اور معاملۂ نجات پیروی نقش قدم رسول سے مربوط ہے، محق و مبطل میں امتیاز پیدا کرنے والی چیز اتباع پیغمبر ہی ہے، زہد و توکل اور تبتل بغیر اتباع رسول کے نامعتبر ہیں، اذکار و افکار اور اشواق و اذواق بے توسل سرکار دو عالم غیر مفید ہیں......... حضرت عبداللہ بن مبارک نے فرمایا جس نے آداب سے سستی برتی، وہ سنن سے محروم ہو گیا جس نے سنن سے غفلت اختیار کی وہ فرائض سے محروم ہوا، اور جس نے فرائض سے تہاون کیا وہ معرفت سے محروم ہو گیا، شیخ ابوسعید ابوالخیر سے لوگوں نے کہا کہ فلاں شخص پانی پر چلتا ہے، انھوں نے فرمایا ہاں گھانس کا تنکا بھی پانی پر چلتا ہے، پھر کہا گیا کہ فلاں آدمی ہوا میں اڑتا ہے، فرمایا چیل اور کوا بھی ہوا میں اڑتے ہیں، پھر کہا گیا کہ فلاں آدمی ایک لحظہ میں ایک شہر سے دوسرے شہر میں چلا جاتا ہے، فرمایا شیطان تو ایک دم میں مشرق سے مغرب تک چلا جاتا ہے، ان باتوں کی کوئی قیمت نہیں، مرد حق در اصل وہ ہے جو مخلوق کے درمیان نشست و برخاست رکھے، بیوی بچے رکھتا ہو، اور پھر ایک لحظہ خدائے عزوجل سے غافل نہ رہے، شیخ علی ابن ابی بکر قدس سرہٗ نے معارج الہدایہ میں فرمایا ہے کہ ہر انسان کا حسن و کمال تمام امور میں ظاہراً و باطناً و اصولاً و فروعاً عقلاً و فعلاً عادۃً و عبادۃً کامل اتباع رسول میں مضمر ہے۔"

(مکتوبات خواجہ محمد معصوم سرہندی مرتبہ مولانا نسیم احمد امروہی ص ۱۴۳-۱۴۲)

اورنگ زیب کا فطری اور ذہنی رجحان ان ہی تعلیمات کی طرف تھا، اس لیے وہ حضرت خواجہ معصوم سرہندی کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو گیا، تیموری خاندان جہانگیر ہی کے زمانے سے حضرت مجدد الف ثانی کی تعلیمات سے متاثر تھا، جہانگیر پہلے تو حضرت مجدد الف ثانی کا مخالف رہا

لیکن پھر ان سے اس کی عقیدت اتنی بڑھی کہ اپنے کو زیادہ تر ان ہی کی صحبت میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اور شہزادہ خرم کو ان کے حلقۂ ارادت میں داخل کر دیا تھا۔[1] عالمگیر نے خواجہ معصومؒ سے بیعت کر کے نہ صرف اپنی خاندانی روایت کو برقرار رکھا، بلکہ ان سے تعلیم پاکر اپنی ایمانی و روحانی بصیرت میں جلا بھی پائی، اور حضرت خواجہ معصوم کو بھی تخت و تاج کے ایک مالک کی ذات میں وہ تمام باتیں ملتی گئیں جن سے ان کو دین و مذہب کے احکام کی اصلاحی تبلیغ میں ہر طرح کی مدد ملتی رہی، اسی لیے وہ عالمگیر کی مذہبی اور روحانی تلقین و تربیت میں برابر مشغول رہے۔

ایک بار ایک مکتوب میں حضرت خواجہ معصوم نے عالمگیر کو یہ حدیث لکھ کر بھیجی کہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، قیامت کب آئے گی، فرمایا تجھ پر افسوس تو نے قیامت کی تیاری کیا کی ہے (جو قیامت کو دریافت کر رہا ہے) اس نے کہا میں نے تیاری تو کچھ نہیں کی ہے، مگر اللہ اور اس کے رسول کو محبوب رکھتا ہوں، ارشاد ہوا تو اس کے ساتھ ہوگا جس سے محبت کرتا ہے، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے اس ارشاد سے صحابۂ کرام کو اتنی مسرت ہوئی کہ میں نے اسلام کے علاوہ کسی چیز سے اتنی مسرت نہیں دیکھی، یہ حدیث لکھ کر حضرت خواجہ معصومؒ عالمگیر کو حب رسول کی تعلیم دے رہے تھے، جو عالمگیر میں پہلے سے موجود تھی، اس میں اور جلا پیدا ہوتی گئی، حضرت خواجہ معصوم کا یہ مکتوب عالمگیر کے کسی خط کے جواب میں تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیر نے ان سے اپنے قلب کی بعض روحانی کیفیات کا بھی اظہار کیا تھا، اور اس کا مداوا چاہتا تھا، شاید عالمگیر پر گریۂ دل طاری رہتا تھا، اسکے جواب میں حضرت خواجہ معصومؒ لکھتے ہیں کہ

"اس مکتوب سے راہ طریقت کا شوق ظاہر ہوتا ہے، اسی لیے مقصد کے حاصل ہونے

---

[1] دیکھو مکتوبات امام ربانی دفتر سوم نمبر ۱۴۳ [2] خزینۃ الاصفیا، ج ۱ ص ۶۱۲

کی امید ہے۔ ایک درویش نے لکھا ہے کہ "اگر نخواستے داد، نداد ے خواست" یعنی اگر اللہ تعالیٰ کچھ دینا نہ چاہتا تو طلب کا مادہ ہی پیدا نہ کرتا، صوفیہ کا یہ مقولہ ہے کہ جب قلب گشتگی سے روتا ہے تو روح یافت پر جوش ہوتی ہے، اس مقولہ کی رو سے گریۂ دل کو جو کہ از راہ طلب و شوق پیدا ہوا ہے، یافت روح پر دلیل قرار دیا گیا ہے، یعنی گریۂ دل ہی سے روحانی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔"

اور پھر اس کی وضاحت صوفیانہ اور عارفانہ انداز میں اس طرح کی ہے:

"لطائف خمسۂ عالم آپس میں پڑوسیوں کا حکم رکھتے ہیں، ان میں بعض لطائف ایک دوسرے سے زیادہ لطیف ہیں، اور جو بھی لطیف تر ہے عالم غیب سے نزدیک تر ہے، اور حضرت وہاب سے فیوض حاصل کرنے میں آگے بڑھا ہوا ہے، جب کبھی ان لطائف میں سے کسی لطیفہ پر کوئی عطیہ وارد ہوتا ہے تو دوسرا لطیفہ جو اس سے قریب ہے، خبردار ہو جاتا ہے، اور اس دولت پر رشک کرتا ہے، اس کی طلب میں کوشش کرتا ہے اور اس کو گریۂ شوق دامن گیر ہو جاتا ہے، اور اگر کسی لطیفہ پر وارد غیبی نمودار نہیں ہوتا ہے تو تمام لطائف غافل رہتے ہیں، اور راہ طلب بند ہو جاتی ہے، پس گریۂ قلب دلیل ہے اس امر کی کہ روح کو کچھ مل گیا، اس لیے کہ قلب و روح کو آپس میں نسبت ہمسائگی اور اتصال حاصل ہے، ایک کی یافت سے دوسرا واقف ہے، اور اس دولت کے نہ پانے سے نالاں اور اس کی طلب میں دواں ہے۔"

اسی خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ معصومؒ نے اپنے ایک صاحبزادے شیخ سیف الدین کو عالمگیر کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تلقین کے لیے اس کے پاس بھیجا تھا، شیخ سیف الدین اپنے والد بزرگوار ہی کی طرح کمالات صوری و معنوی کے حامل ہو گئے تھے، عالمگیر ان کو بہت محبوب

اور مقرب رکھنے لگا تھا، اور جب اس نے ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کا حال حضرت خواجہ معصوم کو لکھ بھیجا

تو وہ مذکورہ بالا مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

الحمد للہ والمنۃ کہ فقیرزادہ (شیخ سیف الدین) منظور نظر قبول ہوگیا ہے، اور اسکی صحبت موثر ثابت ہوئی، امر بالمعروف ونہی عن المنکر جو کہ فقیر زادے کا شیوہ ہے، اسکا آپ نے اظہار شکر و رضامندی کیا ہے، اس اظہار شکر پر شکر خداوندی بجالایا، اور اس سے میری دعاگوئی اور بھی بڑھ گئی ہے، کیا عجب نعمت ہے کہ اس اطلاق بادشاہت اور دبدبۂ سلطنت کے ہوتے کلمۂ حق سمع قبول میں آئے، اور ایک نامراد کا قول موثر ثابت ہو"

اور آخر میں کلام پاک کی ایک آیت لکھ کر اپنے مکتوب کو ختم کرتے ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ مژدہ دیدیجئے میرے ان بندوں کو جو بات کو سنتے ہیں اور نیکو ترین بات کی پیروی کرتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی ہے، اور یہ لوگ صاحبان عقل وخرد ہیں۔ (مکتوبات خواجہ محمد معصوم سرہندی مرتبہ مولانا نسیم احمد امروہی ص ۲۸۱-۸۳)

ایک دوسرے مکتوب میں عالمگیر کو پہلے محبت الٰہی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اللہ کے علاوہ ہر چیز باطل یعنی بے حقیقت اور فانی ہے، پھر لکھتے ہیں کہ ایک باطل ہیچ حق نما ہے اور ایک عدم ہے جو وجود آسا ہے، ہر چیز کی ذات عدم ہے اور عدم ہر شر ونقص کا اولیٰ ولجا ہے، کسی چیز میں صفات کمال کا پایا جانا مرتبۂ وجوب سے مستعار ہے، پس خیر وکمال کا مرجع خدا وند تعالیٰ کی ذات اقدس ہے، جو واجب ہے، اور اور شر ونقص تمام تر ممکن کی طرف راجع ہیں، اسی لیے کلام پاک میں کہا گیا ہے کہ جو بھی بھلائی کسی کو پہنچتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور جو برائی کسی کو پہنچتی ہے وہ خود اس کی ذات سے ہوتی ہے، اور جو کوئی اپنی نادانی سے اپنی ذات کو فراموش کر دیتا ہے، اور اپنے عارضی کمالات کو کامل خیال کرکے اپنے کو مبدا احسانات سمجھتا ہے، وہ گویا مولائے حقیقی سے ہمسری کا

دعویٰ کرتا ہے، اور اس میں رعونت اور انانیت پیدا ہو جاتی ہے لیکن جو کوئی اپنے صفات کمال کو حق تعالیٰ کے کمالات کا پرتو سمجھتا ہے اور ان عارضی کمالات کو بالکلیہ اصل کے حوالہ کرتا ہے اور اپنے آپ کو جو کہ آئینۂ کمالات ربانی ہے، محض خالی سمجھتا ہے، اور معدوم محض دیکھتا ہے تب وہ فنائے حقیقی سے مشرف ہوتا ہے، اور انانیت امارہ سے چھٹکارا پاتا ہے، پھر نفس امارہ تدریجاً نفس مطمئنہ بنتا ہے، اسی وقت نعمت حق اس کے حق میں کامل ہوتی ہے۔

یہ گویا عالمگیر کو نصیحت تھی کہ کسی حال میں بھی وہ اپنے میں انانیت نہ پیدا ہونے دے، عالمگیر نے حضرت خواجہ معصوم سے بارگرانبار جہانداری اور اپنے حسن خاتمہ کے لیے دعا کرنے کی درخواست کی تھی جس پر وہ تحریر فرماتے ہیں کہ وہ اس کے لیے پوری ہمت کے ساتھ برابر دعائیں کرتے رہتے ہیں اور پھر اس کو یہ لکھ کر اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ

"چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے آپ کو اس بارہ میں خوف عنایت فرمایا ہے، اس لیے بہت کچھ امیدیں ہیں، یہ خوف کارہائے مشکل کو آسان کر دیتا ہے، کیونکہ حدیث میں ہے کہ خوف دنیا اور خوف آخرت کسی شخص واحد کے اندر جمع نہیں ہوتے، یعنی اگر کسی کے اندر خوف آخرت ہوگا تو خوف دنیا سے محفوظ رہے گا۔"

عالمگیر نے حضرت خواجہ معصوم کے صاحبزادے شیخ سیف الدین کی بھی تعریف لکھی تھی، اس پر حضرت خواجہ معصوم یہ تحریر فرماتے ہیں:

"فقیرزادے کی ادائیگی خدمت اور لوازم خیر خواہی آپ کی نظر میں پسندیدہ ہیں، یہ بات اس کے لیے موجب سعادت و باعث امتیاز ہوئی، فقیرزادہ جو کہ جامع کمالات صوری و معنوی ہے، عزلت اور عدم اختلاط کی عادت رکھتا تھا، چند آدمیوں میں بیٹھنے کی بھی اس کو عادت نہ تھی لیکن محض خیر خواہی نے اس کو اس بات پر آمادہ کیا ہے

کہ آپ کے پاس گیا ہے"

پھر اپنے صاحبزادے کے توسل کو محض عنایاتِ ربانی کا ایک سبب بتاتے ہیں، اس لیے اورنگ زیب کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں:

"مربی حقیقی اللہ تعالیٰ ہے، وہ خود درد طلب دیتا ہے، اور اپنی طلب میں دوڑاتا ہے اور خود راہ وصل کھولتا ہے، ع

از ما و شما بہانہ بر ساختہ اند

اسی مکتوب میں عالمگیر کے خط کی تحریر کی فصاحت و بلاغت کی تعریف کرتے ہوئے ایک عربی شعر بھی لکھتے ہیں، جس کے یہ معنی ہیں کہ اس کے ہر ہر لفظ میں آرزوؤں کا ایک باغ مضمر ہے اور ہر ہر سطر میں موتیوں کا ایک ہار پنہاں ہے،

"آپ کے مکتوب کے فصاحت رنگین اور بلاغت معانی و ادب کا کیا بیان کروں

ففی کل لفظ منہ روض من المنیٰ وفی کل سطر منہ عقد من الدرر

ایک اور مکتوب میں عالمگیر کے خط کے قلم کو عنبر بار رقم کہہ کر نوازا ہے۔ (مکتوبات حضرت محمد معصوم سرہندی، ص ۸۶ - ۸۳ - ۲۸۲)

حضرت خواجہ معصومؒ کے صاحبزادے شیخ سیف الدین بھی عالمگیر کی باطنی کیفیات سے اپنے والد ماجد کو برابر مطلع کرتے رہتے۔ ایک بار عالمگیر کے "اثرات ذکر و لطائف" "قلت خطرات" "قبول کلمۂ حق" "رفع بعض منکرات" اور "ظہور لوازم طلب" کے متعلق لکھ کر بھیجا تو حضرت خواجہ نے شکر خدا ادا کیا، کیونکہ اس قسم کی باتیں سلاطین میں نہیں پائی جاتی ہیں، اور پھر یہ حدیث لکھی کہ جو سنت کو مردہ ہونے کی صورت میں زندہ کرتا ہے، اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملتا ہے، یہ گویا اپنی طرف سے عالمگیر کو سو شہیدوں کے ثواب کی بشارت دے رہے تھے، اور آخر میں

دعا کرتے ہوئے لکھتے ہیں (مکتوبات حضرت محمد معصوم سرہندی ص ۱۸۰-۲۸۰) :

" بادشاہ کی ظاہری و باطنی صلاحیت کا خواستگار ہوں، ان کے باطن کو نسبت
اکابر سے معمور پاتا ہوں، اور امیدوار ہوں کہ وہ جلد ہی فنائے قلب کی دولت سے
مشرف ہو جائیں گے، یہ فنائے قلب درجات ولایت میں درجۂ اولیٰ ہے۔ ع

با کریماں کارہا دشوار نیست

شیخ سیف الدین نے ایک دوسرے مکتوب میں اپنے والد ماجد کو عالمگیر کی نجی مجلسوں کی خبر دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مجالس سلطانی میں عجیب اسرار جلوہ گر ہوتے ہیں، جو نہی ان کی محفلوں میں داخلہ ہوتا ہے، "عروج و نزول" کی کیفیات کے ساتھ ممتاز کر دیا جاتا ہے، اس کو پڑھ کر حضرت خواجہ معصومؒ نے تحریر فرمایا:

" ٹھیک ہے، اہل کمال ہر قطعۂ زمین سے وہ فیوض و اسرار جو اس کے
مناسب حال ہیں، مشاہدہ کرتے ہیں، اور ہر زمین سے اس زمین کے مناسب کمال
کو حاصل کرتے ہیں کسی زمین کو معاملات فنا کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے، اور کسی کو
کمالات لقا کے ساتھ موافقت ہوتی ہے کسی قطعہ کو عروج سے مناسبت ہے
اور کسی کو نزول سے، حرم مکہ کے کمالات و معاملات جدا ہیں، حرم مدینہ کے فیوض
و کاروبار جدا۔ ع

ہر خوش پسیرے را حرکات دگر ست

اسی مکتوب میں حضرت خواجہ لکھتے ہیں:

" تم نے بادشاہ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان کے اندر دست
لطیفۂ اخفیٰ اور اس سے مناسبت تامہ کا پتہ چلتا ہے، اس بات کے مطالعہ سے

خوشی ہوئی، لطیفۂ اخفیٰ سب سے بڑا لطیفہ ہے، اور اس کی ولایت سب ولایات سے اونچی ہے، اس لطیفہ کو خاص سرورِ کائنات کے ساتھ خصوصیت حاصل ہے فقیر بھی بادشاہ کے اندر لطیفہ اخفیٰ کی مناسبت پاتا ہے، والغیب عند اللہ"

(مکتوبات حضرت محمد معصوم سرہندی ص ۸۹-۲۸۸)

ظاہر ہے کہ یہ خطوط بہت ہی نجی تھے، جن کو لکھتے وقت کبھی کاتب کو خیال نہ آیا ہوگا کہ یہ طبع ہو کر عام لوگوں کے ہاتھوں میں بھی پہنچیں گے اسلیے ان میں کسی مصلحت یا ذاتی منفعت کی جھلک نہیں پائی جاتی ہے، بلکہ امرِ واقعہ کا اظہار ہے، اس لیے ان خطوط کو پڑھ کر یہ کہنے میں تامل نہیں کہ عالمگیر نے شریعت کی پابندی کرکے راہ سلوک کی بہت سی اعلیٰ منزلیں بھی طے کرنے میں لگا ہوا تھا، اسی لیے وہ اپنی بادشاہت کے زمانے میں کسی ایسے صوفی کی طرف مائل نہ ہوا جو "احوال و مواجید" اور کشوف و الہامات کے قائل تھے، اور بدعتوں میں مبتلا ہو کر ترک امر معروف کرتے اور سنت کے متبع نہ ہوتے، بلکہ جو صوفیہ کرام شریعت کے پابند ہوتے وہ ان کی ہر طرح مدد کرنے کو تیار رہتا، ان کے پاس بے تکلف جاتا، انکی نصیحتیں سنتا، بلکہ ان کی جھڑکیاں بھی برداشت کرتا،

برہان پور کے ایک بزرگ شیخ نصیر الدین ہروی تھے، وہ اپنی جوانی میں دونوں پاؤں اور بائیں ہاتھ سے مجبور ہو گئے تھے، لیکن ایک ہاتھ سے کلام اللہ اور تفسیر کی کتابت کرکے روزی پیدا کر لیا کرتے تھے، کوئی نذر نیاز پیش کرتا تو قبول نہ کرتے، دولت مندوں اور شاہی عہدیداروں سے ملنا پسند نہ کرتے، برابر تلاوت کلام پاک میں لگے رہتے، تلاوت کرتے وقت ان کی آنکھوں سے آنسو جاری رہتا، عالمگیر کو ان کے توکل، استغنا، صلاح، تقویٰ اور فضیلت کی خبر ملی، تو برہان پور کے صدر کے ذریعہ سے کوئی جاگیر دے کر ان کی مدد کرنی چاہی لیکن انھوں نے جاگیر لینے سے یہ کہکر انکار کیا کہ میری طرح لاکھوں اور گروروں محتاجوں کو جو رزق دیتا ہے وہی مجھکو بھی

رزق دے گا" (منتخب اللباب جلد دوم ص ۵۵۸)

سورت کے ایک بزرگ سید سعد اللہ تھے، جو شیخ پیر محمد سلونی کے نواسے تھے عقلی و نقلی علوم اور سلوک کی تعلیم پا کر مکہ معظمہ چلے گئے، جہاں شریف مکہ نے ان کو بڑے اعزاز و اکرام سے رکھا، وہ شریف مکہ سے لوگوں کی سفارش برابر کرتے رہتے، شریف مکہ نے ان کی ایک دو سفارش کو نظر انداز کر دیا، تو وہاں سے بد دل ہو کر سورت چلے آئے، عالمگیر کو ان کے فضل و کمال کا حال معلوم ہوا تو اس نے ان کی خانقاہ کے لیے ایک مکان اور ان کے اخراجات کے لیے دو گاؤں وقف کر دیے، ہندو مسلمان دونوں ان کے یہاں آتے اور مستفیض ہو کر جاتے، اور دونوں ان کو اپنا پیشوا سمجھتے، وہ خلق اللہ کی نفع رسانی کی خاطر ہر خاص و عام کی سفارش عالمگیر سے کیا کرتے تھے، عالمگیر بھی ان کو دست خاص سے خط لکھا کرتا تھا، ایک بار اس نے ان کو لکھا کہ وہ صرف درویشوں، عالموں اور دینداروں کے لیے سفارش کیا کریں مگر انھوں نے بادشاہ کی بات نہ مانی، دو بار انھوں نے عالمگیر کو لکھ بھیجا کہ وہ ائمہ اثنا عشری سے محبت کرنا اپنا فرض سمجھے، عالمگیر نے بعض فضلا سے اس کے متعلق استفسار کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے، صحیح ہے، ایک بار سید سعد اللہ نے ایک ہندو کو خط لکھا تو القاب کے بجائے یہ شعر تحریر کیا:

بنام آنکہ او نامے ندارد   بہر نامش کہ خوانی سر بر آرد

اس پر بعض علما نے اعتراض کیا لیکن سید سعد اللہ نے یہ جواب دے کر ان کو خاموش کیا کہ ہم ذات پاک واجب الوجود کے بغیر تمام ممکن الوجود کو معدوم الوجود جانتے ہیں،

تا بدوں ذات پاک واجب الوجود ہمہ ممکن الوجود را معدوم الوجود میدانیم" (منتخب اللباب ج ۲ ص ۱۳۹)

ایک دوسرے بزرگ میر مرتضیٰ واعظ ملتانی بھی تھے شریعت کی پابندی کا بہت لحاظ رکھتے

جہاں مجلس سماع ہوتی وہاں نہ جاتے، اور لوگوں کو اس میں شریک ہونے سے منع کرتے، جس محلہ میں رہتے، وہاں سرود و نغمہ کی آواز بلند کرنے کی کسی کی ہمت نہ ہوتی، شاہی حاکموں کے یہاں کھانا نہ کھاتے، اگر کوئی ان کے پاس آتا اور کہتا کہ مرید ہونے آیا ہوں تو وہ فرماتے یہ نہ کہو بلکہ یہ کہو کہ توبہ و استغفار کرنے آیا ہوں، اور آیندہ کوئی بات یا کام شرع کے خلاف نہ کرونگا، پھر طرح طرح کے سوال کرتے، اور وہ جواب دیتا کہ ہر حال میں خدا کا حکم بجا لاؤں گا، تو پھر اپنے حلقۂ ارادت میں لیتے، اس طرح ملتان اور لاہور سے دکن تک ہزاروں مریدان کے گرد جمع ہوگئے تھے، کسی سے نذرانہ نہ لیتے جب تک کہ ان کو یقین نہ ہو جاتا کہ نذرانہ دینے والے کی کمائی حرام کی نہیں ہے، اور وہ اپنی بیوی کا نفقہ اور فرزندوں کے حقوق کو ادا کرتا ہے، نذرانہ لیکر اس کے ایک خمس سے تجارت کرتے، روزے برابر رکھتے، شب بیداری کرتے تلاوت کلام پاک میں مشغول رہتے، اور جب وعظ کہتے تو ظالم حکام، ریاکار علماء اور حکام کے مصاحب فقراء کی بڑی مذمت کرتے، اور ایسے حکام کو برا کہتے جو خدا اور رسول کے احکام کی خلاف ورزی کرتے، سرود و نغمہ سنتے، اور بزرگوں کے مزار پر رقص و سماع کی محفل کراتے، ایسے بدعتی عوام کے خلاف بھی وعظ کہتے جو شب برات، عاشورہ اور عیدین میں خلاف شرع باتیں کرتے رہتے، میت کے نام پر کھانے پکوا کر تقسیم کرتے، اور ان کے نام سے فاتحہ دیتے، تمباکو کو حرام بتاکر اس کے پینے کی سخت مخالفت کرتے، ان کی اس شدت پسندی سے حکام، علماء اور مشائخ کو بھی ان سے عداوت ہوگئی تھی، اورنگ آباد کے قاضی القضاۃ قاضی اکرم ان کے بڑے مخالف ہوگئے تھے، اور ایک بار انھوں نے ان سے مناظرہ کیا تو بڑی نازک صورت حال پیدا ہوگئی تھی، عالمگیر پونا کے قلعہ کی تسخیر کے لیے وہاں پہنچا، تو میر مرتضیٰ اس سے ملنے گئے اور اپنی ایک کتاب اس کو دی، جس کا نام حق گو تھا، عالمگیر نے اس کے دو تین ورق پڑھ کر کتاب کو

زانو پر رکھ دیا، اور دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر کہا الحمد للہ ثم الحمد للہ ہمارے زمانہ میں ایسے حق گو بھی ہیں، اور پھر شہزادہ کام بخش کو کہا کہ سید صاحب کو اپنے گھر میں ٹھہراؤ، اور وہ جو کچھ فرمائیں انکو سنکر ان کو عمل میں لاؤ، عالمگیر نے ان کے لیے کچھ ذریعۂ معاش بھی مقرر کرنا چاہا لیکن انھوں نے قبول کرنے سے انکار کیا، کچھ دنوں کے بعد عالمگیر نے ان سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کو ایک ایسا شہر دیدوں جو آپ کے احتساب کے مطابق ہو جائے، انھوں نے جواب دیا کہ اگر خواص کے احتساب کے لیے مجھکو مقرر کریں تو میں راضی ہوں، عوام تو میرے گرویدہ پہلے ہی سے ہیں، عالمگیر نے کہا کہ خواص وعوام کے معنی نہ سمجھ سکا، اس وقت قاضی اکرم بھی موجود تھے، وہ بول اٹھے کہ سید صاحب کا مطلب بزرگوں کے مقبروں سے ہے، وہ اپنے مواعظ میں کہتے ہیں کہ جن بزرگوں کی قبروں پر طنبور، دہل اور دوسرے ساز بجائے جاتے ہیں، ان کی ہڈیوں کو اکھاڑ کر جلا دینا چاہیے، عالمگیر نے یہ سنکر کہا کہ میں اس حد تک جانے کے لیے تیار نہیں ہوں، میر مرتضیٰ نے انکار کیا کہ وہ ایسا نہیں کہتے، لیکن ان کی بات اس وقت نہ بنی، اور گو عالمگیر ان کی عزت کرتا رہا لیکن انھوں نے بادشاہ کے یہاں آنا جانا کم کر دیا، اور جب عالمگیر ان کو بلاتا تو وہ جاتے، پھر وہ علماء اور مشائخ کی مخالفت کے خیال سے برہانپور منتقل ہو گئے۔ (منتخب اللباب ج ۲ ص ۵۶۵-۵۶۱)

دہلی کے ایک بزرگ شیخ بایزید تھے، جن کے ہندو مسلمان دونوں معتقد تھے، وہ محتاجوں کی خبر گیری کرتے، اور حکام سے ان کی سفارش کرنے میں مطلق دریغ نہ کرتے، ایک بار دہلی کی جامع مسجد میں وعظ میں کہنا شروع کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لڑکیوں کی شادی ضرور کی، پھر عالمگیر کو مخاطب کرکے کہا کہ اس کی لڑکیوں میں بعض ناکتخدا کیوں ہیں، عالمگیر نے ان کے وعظ کو بہت خاموشی سے سنا۔ (منتخب اللباب ج ۲ ص ۵۵۰)

عالمگیری عہد میں ملا قطب الدین شہید سہالوی بھی بڑے برگزیدہ بزرگ تھے، عالمگیر نے ان سے

کئی بار ملنے کی خواہش ظاہر کی مگر ہر بار ملا صاحب نے اس سے ملنے سے انکار کیا، ان کی اس بے رخی سے وہ کبھی دل گیر نہ ہوا۔ (فرحۃ الناظرین ص ۸۰)

شاہ ولی اللہ کے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم اپنے علم وفضل، عبادت، ریاضت، زہد و تقوی و تورع کے لحاظ سے مایۂ ناز علماء میں سے گذرے ہیں، ان ہی کے خاندان سے علمی و روحانی فیوض و برکات کا وہ سرچشمہ پھوٹا ہے جس سے آج تک ہندو پاک کے ارباب علم اور اصحاب دل سیراب ہوئے ہیں، عالمگیر نے فتاوی عالمگیری کی تدوین شروع کرائی تو ان سے بھی معاونت چاہی، وہ شاہی دربار سے کسی قسم کی وابستگی پسند نہیں کرتے تھے، مگر اپنی والدہ کے اصرار پر فتاوی عالمگیری کی ترتیب میں شریک ہوگئے، لیکن شاہ صاحب کے مرشد حضرت خلیفہ ابوالقاسم نے دربار سے یہ تعلق پسند نہ کیا، اس لیے وہ جلد ہی اس کام سے علحدہ ہوگئے، عالمگیر نے کچھ جاگیر دینی چاہی لیکن اسکو قبول کرنے سے انکار کیا، عالمگیر ان سے ملنے کا بڑا مشتاق رہتا، مگر وہ بادشاہوں اور امیروں کے گھر جانا اپنے روحانی بزرگوں کے مسلک کے خلاف سمجھتے تھے، ایک بار عالمگیر نے شاہ صاحب کے مخلص کے ذریعہ شوق ملاقات کا پیام بھیجا، مگر وہ دربار میں جانے پر مطلق راضی نہ ہوئے، بلکہ ایک معمولی کاغذ جس میں ان کے جوتے لپٹے رکھے ہوئے تھے، یہ عبارت لکھکر اسوقت کی دنیا کی سب سے بڑی حکومت کے شہنشاہ کے پاس بھیجدی۔

"اہل اللہ کا اس پر اجماع ہے کہ وہ فقیر بہت برا ہے جو امیروں کے آستانہ پر ہو، حق سبحانہ تعالے فرماتا ہے کہ وَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا إِلَّا قَلِيْلٌ یعنی دنیاوی زندگی کا سرمایہ بہت ہی قلیل ہے، تم کو قلیل ترین جزء ملا ہے، اگر بالفرض مجھے وہ مل گئے تو وہ جزء لایتجزی ہوگا، اس کو کرنے کے لیے جو ٹکڑا نہ ہو سکے گا، میں اپنے نام کو خدا تعالی کے دفتر سے کیوں نکلواؤں، چشت کے بعض ملفوظات میں مذکور ہے کہ جس کا نام بادشاہ کے دفتر میں لکھ لیا جاتا ہے، حق تعالی کے دفتر سے اس کا نام کٹ جاتا ہے"
(انفاس العارفین از شاہ ولی اللہ ص ۹۹)

شاہ ولی اللہ اس خط کو نقل کرکے تحریر فرماتے ہیں کہ عالمگیر کو جب یہ رقعہ ملا تو اس نے اپنی جیب میں رکھ لیا، اور جب کپڑے بدلتا تو پھر اس کو اپنی جیب میں رکھ لیتا، فرصت کے وقت اس کو پڑھ کر روتا تھا۔

اوپر کی تفصیلات سے اندازہ ہوگا کہ عالمگیر ایک راسخ العقیدہ مسلمان بننے کی کوشش کرتا رہا، اور راہ طریقت پر چلنے کے باوجود وہ شریعت کا بڑا پابند تھا۔ آج کل کے غیر مسلم مورخین اس کا ایک حکمران کی حیثیت سے مطالعہ کرتے ہیں، تو اس کی شریعت نوازی پر تنقید و تنقیص دونوں کرتے ہیں، کیوں؟ اس کا جواب اس مقالہ کے موضوع کے دائرہ سے باہر ہے، لیکن کوئی مسلمان اس کے خلاف برے الفاظ سننا پسند نہیں کرتا، محض اس لیے کہ اس نے اپنے زمانہ کے مسلمانوں میں مذہب کی ایک نئی روح پیدا کرنی چاہی، لیکن کیا یہ مستقل طور پر بیدار رہ سکی؟ اگر نہ رہ سکی تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟ سلاطین یا علماء یا مشائخ؟ جس طرح عالمگیر کے جانشینوں پر یہ الزام عائد ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر کی اُس سلطنت کو سنبھال نہ سکے جس کو اس نے غزنی سے چاٹگام اور کشمیر سے کرناٹک تک پھیلا دیا تھا، اسی طرح علماء اور مشائخ پر بھی یہ الزام آتا ہے کہ عالمگیری عہد میں مسلمانوں میں جو نئی مذہبی روح بیدار ہو گئی تھی، اس سے وہ نبی کے وارث بن کر پوری بیدار مغزی سے فائدہ اٹھاتے، اور مسلمانوں کی مذہبی، روحانی، اخلاقی اور معاشرتی زندگی کو ہر طرح سنوارتے رہتے تو اس وقت مسلمانوں کی سیاسی زندگی بھی کچھ اور ہوتی، انھوں نے درس و تدریس کی مسند اور محراب و منبر اور خانقاہ کی زینت ہی بننے پر اکتفا کیا، اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں وہ کام انجام نہ دے سکے جن کی ان سے توقع تھی، یا جو بگڑتی ہوئی معاشرت اور سیاست یا بدلتی ہوئی صورت حال میں ان کو اپنے مذہبی فکر و عمل، ایمانی جوش و طاقت اور روحانی بصیرت و تدبر سے کرنا چاہیے تھا۔

فیضی اور اسکی تفسیر سواطع الالہام

از جناب محمد سالم صاحب قدوائی ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ہندوستان میں تفسیر پر خاصا متنوع کام ہوا ہے، کچھ علماء نے علمی و فنی تفسیریں لکھیں، کچھ نے قرآن مجید سے احکام شرعیہ کا استخراج کیا، کچھ نے شرحیں اور حواشی لکھے، اسکے ساتھ بعض لوگوں نے اپنی ادبی مہارت اور زبان پر عبور کا بھی ثبوت پیش کیا۔ اسی قسم کے لوگوں میں عہد اکبری کی مشہور و معروف شخصیت شیخ ابوالفیض فیضی بن شیخ مبارک کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے، یوں تو فیضی کی شہرت اور اہمیت اس کی فارسی شاعری کی وجہ سے بہت ہے، لیکن اس کی عربی زبان کی صلاحیت بھی غیر معمولی تھی۔ اس کا بین ثبوت اس کی تفسیر سواطع الالہام ہے۔ فیضی نے یہ تفسیر غیر منقوط الفاظ میں لکھی ہے، جسے ادب کی اصطلاح میں "صنعت مہملہ" کہتے ہیں، عربی زبان میں اس قسم کی تصنیف کرنا ایک غیر معمولی کارنامہ ہے، اور پھر پورے قرآن کریم کی تفسیر وہ بھی مختصر نہیں بلکہ تقریباً سات سو صفحات میں؛ فیضی نے اس اہم کام کو بہت تھوڑی سی مدت میں مکمل کر لیا۔ علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں:

"سواطع الالہام یعنی تفسیر غیر منقوطہ ۱۰۰۲ھ میں تمام ہوئی اکل مدت تصنیف دو ڈھائی برس ہے، اس تفسیر پر فیضی کو بڑا ناز ہے، دوستوں کو جو خطوط لکھے ہیں انمیں اکثر فخر سے اس کا تذکرہ کرتا ہے۔" [۱]

---

[۱] شعر العجم جلد ۳ ص ۵۸

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی اس تفسیر کے سلسلہ میں لکھتے ہیں :

" برہان فضیلت شیخ فیضی سواطع الالہام تفسیر بے نقط است کہ ہزار سال پیشتر

ہیچ مستعدی را میسر نشد، طرفہ این کہ این چنین کار دشوار را در عرض دو سال از

مبدا بہ منتہی رسانید "۔ ؎۱

فیضی کو دربار اکبری میں بڑی حیثیت حاصل تھی، شروع میں تو درباری چشمک کی وجہ سے اسے خاصی پریشانی اٹھانی پڑی، ان کے باپ شیخ مبارک اور بھائی ابوالفضل تینوں ٹھوکریں کھاتے پھرے لیکن پھر بعد میں بڑی جد وجہد اور مختلف وسیلوں سے دربار اکبری میں پناہ ملی، اکبر ان لوگوں کی بہت عزت کرتا تھا، دربار میں ان کا خاص مرتبہ تھا، دونوں بھائی انتہائی ذہین تھے، اس لیے تھوڑے ہی عرصہ میں ان کو اکبر کے مزاج میں بڑا رسوخ حاصل ہو گیا، اسکی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کٹر مذہبی طبقہ اکبر کے خلاف تھا اور اس کو مختلف فتوؤں میں الجھائے رکھتا تھا، اس دور کی اس کشمکش کو ختم کرنے میں ان دونوں بھائیوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے، علامہ شبلی نے لکھا ہے :

" اکبر مخدوم الملک اور شیخ عبد النبی کی تنگ خیالیوں سے تنگ آچکا تھا اور ان لوگوں کے زور کو گھٹانا چاہتا تھا لیکن خود جاہل تھا اس لیے مذہبی فتوؤں کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا، فیضی اور ابوالفضل دربار میں پہنچے تو اکبر کو گویا اوزار ہاتھ آگئے، ان لوگوں نے ہر موقع پر ان متعصبوں کو شکستیں دیں اور ان کا سارا بھرم کھل گیا "۔ ؎۲

اکبر تو فیضی اور ابوالفضل سے خوش تھا لیکن دربار کے دوسرے مذہبی لوگ جو خود اکبر کی

؎۱ ماثر الکرام ص ۱۹۹ ؎۲ شعر العجم ج ۳ ص ۳۰

بے اعتدالیوں سے پریشان تھے، ان دونوں بھائیوں سے بھی برگشتہ ہوگئے، اور ان کے ہر کام کو عیب کی نظر سے دیکھنے لگے فیضی شروع ہی میں مذہبی امور میں بہت آزاد خیال تھا، اس لیے کٹر مذہبی طبقہ میں بے دین سمجھا جاتا تھا جس کا اظہار بھی اس دور کے مذہبی لوگوں نے جابجا کیا ہے، خاص طور سے ملا عبدالقادر بدایونی اس میں پیش پیش ہیں، اس لیے جب فیضی نے اپنی تفسیر مکمل کی تو لوگوں نے اس کے خلاف طرح طرح کی باتیں پھیلائیں، ملا صاحب لکھتے ہیں:

"تفسیر بے نقط برائے شستن بدنامی کہ تا روز جزا بصد آب شستہ نگردد در عین حالت مستی و جنابت می نوشت وسگاں آں را از ہر طرف پائمال ساختند" [۱]

اس کے علاوہ بھی طرح طرح کے الزامات لگائے گئے لیکن تفسیر دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سب باتیں بے بنیاد اور محض دربار دشمنی پر مبنی ہیں فیضی اگر چاہتا تو تفسیر میں اپنی آزاد خیالی کو قائم رکھتا اور کلام اللہ کے معانی و مفہوم میں تحریف سے کام لیتا لیکن اس نے ایک جگہ بھی ایسا نہیں کیا ہے، محمد حسین آزاد نے لکھا ہے:

"زبانی باتوں میں ملا صاحب جو چاہیں کہیں مگر نفس مطالب میں جب نہ اب کوئی قدم نہیں اٹھ سکتا، ورنہ ظاہر ہے کہ وہ بے دینی اور بد نفسی پر آجاتے تو جو چاہتے لکھ جاتے انھیں ڈر کس کا تھا" [۲]

علامہ شبلی لکھتے ہیں:

"فیضی نے تفسیر ان واقعات کے بعد لکھی ہے لیکن ایک ذرہ مسلمات عام کی شاہراہ سے نہیں ہٹا، حالانکہ تفسیر میں ہر قدم پر اس کو آزاد خیالی دکھانے کا موقع حاصل تھا، ملا صاحب تو فرماتے ہیں کہ وہ تمام عقائد اسلام کا منکر تھا لیکن وہ ان تمام عقائد کا معترف

---

۱ منتخب التواریخ ج ۲ [illegible]

نظر آتا ہے جن کو معتقدات عوام کہتے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ فیضی کی مذہبی آزادی ہم جو سنتے ہیں زبانی سنتے ہیں، تصنیفات میں تو وہ ملائے مسجدی نظر آتا ہے"۔

ملا بدایونی کا بھی عجیب معاملہ ہے، کہاں تو فیضی اور اس کی تفسیر کی اتنی مخالفت اور بدعت اور دوسری طرف خود اس کی تاریخیں کہیں اور تقریظیں بھی لکھیں۔ لکھتے ہیں:

"وفقیر من" احسن التفاسیر بسم اللہ الرحمن الرحیم علم القرآن تاریخ یافت و توقیعی نوشت انشاء اللہ بتقریبی در محل خود مذکور گردد"۔[۲]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فیضی کے خلاف ملا صاحب کے جذبات و خیالات کی بنیاد حسد پر قائم تھی، فیضی نہایت ذہین و دانشمند تھا، اور ملا صاحب پر بازی لے گیا تھا، اکبر پر بھی اس کا بہت اثر تھا۔ اس لیے ملا صاحب شاید اس کو برداشت نہ کر سکے۔ علامہ شبلی ابو الفضل کے بارہ میں ملا صاحب کے خیالات کو بے بنیاد ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ملا صاحب اور ان کے تمام پیرؤوں نے متفقاً فیضی کو ملحد، بے دین، زندیق اور کافر لکھا ہے، ملا صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ فیضی مرنے کے وقت کتوں کی طرح بھونکتا تھا، اور اس کے ہونٹ سیاہ ہو گئے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ فیضی کے رتبہ کو سمجھ نہیں سکتے تھے، وہ جو حکیمانہ خیالات ظاہر کرتا تھا، ان لوگوں کو الحاد اور زندقہ نظر آتا تھا"۔[۳]

ابتدا میں فیضی کے تعلقات شیخ عبد الحق محدث دہلوی سے بہت خوشگوار تھے، دونوں آپس میں بے تکلف تھے، اور ایک دوسرے کا بڑا لحاظ رکھتے تھے، لیکن مکہ معظمہ سے واپسی کے بعد شیخ کے مزاج میں بڑی تبدیلی ہو گئی تھی، ان کی روحانیت بہت بڑھ گئی تھی، انھوں نے فیضی کو اس وقت

۱؎ شعر العجم ج ۳ ص ۲۵ ۲؎ منتخب التواریخ ج ۳ ص ۳۰۹ ۳؎ شعر العجم ج ۳ ص ۴۸

دیکھا تھا جب وہ متعصب علماء کا زور گھٹانے میں مصروف تھا، اور عام لوگوں کی نظر میں لامذہب سب سے [illegible] سمجھا جاتا تھا، شیخ کے ذہن میں اب بھی فیضی کی وہی تصویر تھی، اس لیے وہ اب سواطع الالہام، موارد الکلم اور نل دمن والے فیضی سے بھی نہ ملنا چاہتے تھے، انھوں نے اس سے قطع تعلق کر لیا،[1] شروع میں فیضی کو اس کا اندازہ نہ ہو سکا، چنانچہ شیخ کی واپسی کے بعد فیضی نے ان کو خط لکھا اور شوقِ ملاقات کا اظہار کیا:

"اگر بال و پرے می داشتم ہر روز بر بام آں حجرہ می نشستم و دانہ چین نکات محبت می شدم۔"

اسی طرح سے جب فیضی تفسیر لکھ رہا تھا، تو اس نے کئی بار اس کی کوشش کی کہ شیخ کو دکھائے اور ان سے مشورہ لے، مگر شیخ غالباً فیضی سے بہت زیادہ خفا تھے، اس کا موقع نہیں دیا، صاحب نزہۃ الخواطر نے شیخ عبدالحق کی رائے اس طرح سے پیش کی ہے:

قال الشیخ عبد الحق ابن سیف الدین	شیخ عبدالحق ابن سیف الدین اپنی کتاب
الدہلوی فی کتابہ فی اخبار	اخبار الشعرا میں لکھتے ہیں کہ فیضی اپنے زمانہ
الشعراء انہ کان ممن تفرد فی	میں فصاحت و بلاغت اور تحریر کی متانت
عصرہ بالفصاحۃ والبلاغۃ	و استواری میں منفرد تھا، لیکن کفر و ضلالت
والمتانۃ والرصانۃ ولکنہ	کے گڑھے میں گرنے کی وجہ سے اسکی پیشانی
لوقوعہ وہبوطہ فی ہاویۃ	رد و انکار و ادبار سے داغدار ہو گئی تھی،
الکفر والضلالۃ اثبت علی	اس لیے دیندار طبقہ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم
جبینہ نقوش الرد والانکار	کے احباب اور جو لوگ آپ سے نسبت
والادبار ولذا الذی یتنکف	رکھتے ہیں، فیضی اور اس کے ہم مشربوں

---

[1] حیات عبدالحق ص ۲۲۲

اهل الدين والملة واحباء النبي ... کا نام لینا پسند نہیں کرتے۔

صلى الله عليه وسلم ومن ينتسب اليه من

ان يذكروا اسمه واسما ورهطه

تاب الله عليهم ان كانوا مومنين[1]

لیکن ان باتوں کا اثر اس کی تفسیر میں کہیں نظر نہیں آتا، فیضی عقائد اسلام پر پورا ایمان رکھتا تھا، اپنی تفسیر اور دوسری تصانیف میں علمائے مسجدی نظر آتا ہے اور کہیں بھی آزادخیالی کا اظہار نہیں کرتا، تفسیر کی ابتدا یوں کرتا ہے:

"الله لا اله الا هو لا اعلمه ماهو وما ادركه كما هو، احامد الحامد ومحامد الاحامد لله مصعد لوامع العلم ومطلع سواطع الالهام"

تفسیر کے شروع میں مقدمہ ہی سے اس کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ فیضی کے خیالات میں بے راہ روی اور مذہب سے بیگانگی نہیں ہے، بار بار اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا ہے کہ اس کے کام کو آسان اور جلد مکمل کرا دے، قرآن مجید کی عظمت و اہمیت کا ذکر کرتا ہے، اور اسے تمام علوم اور حکمتوں کا منبع قرار دیتا ہے۔

اس کے بعد اپنے مولد آگرہ کا ذکر کیا ہے اور اس کی بڑی تعریف کی ہے، یہاں کے علماء کی مجلسوں، مدرسوں، مسجدوں وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے، علوم قرآنی کی تفصیل بیان کی ہے، اس کے بعد بادشاہ کی تعریف کی ہے، اور اس کا نام معمہ میں اس طرح لکھا ہے:

"وهو وسط الدل ماء (دال اعتراف ہو جس کے معنی گہرا سمندر، اس کا وسط یعنی ر) امد الساحل (ساحل کا آخری حصہ یعنی ل) نجوا والسماء۔

---

[1] نزہتہ ج ۵ ص ۷۶

(سماء کا جھنڈا یعنی ا) ستر العلوم (یعنی علوم کا راز ل) علم الاکمال (اکمال کا علم یعنی ا) اس العدل (عدل کی بنیاد یعنی لم) اساس الاسعاد (سعاد کی اساس یعنی د) حصول الود (ود کا حصول د) حاصل الکل (کل کا مترادف اجمعین ہے اس طرح سے "ین" اس کا حاصل ہوا) اصعد الملوک (ملوک کا بلند حصہ یعنی م) اصل الصوالح (صوالح کا اصل ح) مطلع المکارم (مکارم کا مطلع یعنی م) امام الدول (دول کے سامنے کا حصہ د) عماد العالم (عالم کا ستون یعنی ا) معاد المعارک (معارک کا معاد ک) حد الاحلام (احلام جس کا مترادف الباب ہے، کا آخری حصہ ب) مآل الادوار (ادوار کا انجام یعنی ر)

ان تمام حروف کو یکجا اور مرتب کرنے سے بادشاہ کا پورا نام یعنی جلال الدین محمد اکبر بنجاتا ہے، اسی طرح سے اپنا، اپنے والد اور اپنے بھائیوں کا تعارف کرایا ہے، چونکہ نام میں نقطے آتے ہیں، اس لیے فیضی نے ... والی ترکیب استعمال کی ہے، اور اشاروں کنایوں میں تمام لوگوں کے نام لکھے ہیں، اپنے والد شیخ مبارک کا نام اس طرح لکھا ہے:-

"اساس العلم (علم کی بنیاد یعنی آخری حصہ م) اصل الروع (روع کا مترادف قلب ہے، اس کی جڑ یعنی ب) مطلع الالہام (الہام کا پہلا حصہ ا) راس الرؤس (رؤس کا سر یعنی پہلا حصہ ر) امام الکرام (کرام کا سامنے کا حصہ ک)

اس طرح سے مبارک کے پانچ حروف یعنی م + ب + ا + ر + ک نکلتے ہیں، اس انداز کو اختیار کرنے کی وجہ سے بڑی تعقید پیدا ہو گئی ہے، اور جب تک پہلے سے ناموں کا صحیح علم نہ ہو سمجھ میں نہیں آسکتے لیکن اس سے فیضی کی عربی زبان پر قدرت کا اندازہ ضرور ہوتا ہے،

فیضی نے تفسیر لکھنے سے پہلے مشق کے طور پر "موارد الکلم" بھی بے نقط لکھی تھی، اس کی نقلیں مختلف ملکوں میں بھیجیں جس کو لوگوں نے پسند کیا۔

جب فیضی نے اس تفسیر کو لکھنے کا ارادہ کیا اور اپنے والد سے اس کا ذکر کیا تو وہ بہت خوش ہوئے، اور جب اس کے اجزاء مختلف اوقات میں حکمران کو دکھائے تو انکی مسرت و شادمانی بہت بڑھ گئی، انھوں نے بہت سراہا، اور بڑی ہمت افزائی کی، جس کا ذکر فیضی نے تفصیل سے کیا ہے[1]، اس کے بعد اسی مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ یہ تفسیر لکھی جارہی تھی کہ بادشاہ نے اپنے پاس بلالیا، اس لیے یہ کام رک گیا، لیکن پھر تھوڑے عرصے کے بعد فیضی کو اسے مکمل کرنے کا خیال آیا، یہاں فیضی نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس نے اس کام کو کرنے کا موقع دیا، تھوڑے عرصہ بعد تفسیر لاہور میں مکمل ہوگئی[2]۔ اس تفسیر میں فیضی نے جو انداز اختیار کیا ہے، اس کے متعلق خود لکھا ہے:

"کل کلام اورده المحرر لصدع کلام الله واعلاء مدلوله هو المع

مما اوله ومدلوله اصح والکلم العس مدلولها وایرادها المحرر

واسطه الکلام لعمرک ما هو مدلول اصل کلام الله وما حررها

الا لاعلاء احوال الرسل والامم واعلاء دواع لارسال السور

والکلام والکلم وما هو اصل المراد[3]۔"

خدا معلوم لوگوں نے فیضی کو ملحد و بیدین کیسے کہدیا، اس کی تصانیف میں کہیں بھی اس کا ثبوت نہیں ملتا، اگر وہ ملحد اور بے دین ہوتا تو قرآن کریم کی تفسیر کیوں لکھتا؟ اور اگر لکھا تھا تو اس کے معنی و مفہوم کو مسخ کرنے کی کوشش کرتا، تفسیر میں تو اس کے بہت سے مواقع تھے، تفسیر کے

---

[1] ص ۸ [2] ص ۹ [3] ایضاً

مقدمہ میں بھی بہت کچھ لکھ سکتا تھا، لیکن اس نے کہیں بھی ایسا نہیں کیا ہے، بلکہ لکھتا ہے:

اصل المراد واس المرام هو الله وحده وله رسل ارسلهم لاصلاح العالم وهم موصل المراد لاحصر لاعدادهم اولهم آدم واسدهم وحاداهم محمد صلعم، اكمل الرسل امرا واعلمهم سرا واحمدهم حالا واسماهم كمالا واكرمهم ولاء واعلاهم لواء محمد رسول الله صلعم له لواء الحمد وماواه المحمود لواءه مآل اهل الولاء ودعاءه موسوم الواح السماء۔[1]

اصل مقصود و مراد صرف اللہ ہی ہے، اس کے رسول ہیں جن کو اس نے عالم کی اصلاح کے لیے بھیجا ہے، وہ مراد تک پہنچانے والے ہیں، ان کی تعداد کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، ان میں سب سے پہلے آدم اور آخری محمد صلعم ہیں، جو رسولوں میں سب سے کامل، امر الٰہی کے سب سے زیادہ جاننے والے، احوال میں سب سے زیادہ قابل تعریف، کمالات میں سب سے بلند، ولا میں سب سے اکرم، سب سے اونچے پرچم والے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، آپ ہی کے لیے حمد کا لواء ہے، اور آپ کا مقام محمود ہے، ان کا لواء اہل ولا کا مآل اور ان کی دعا آسمان کی الواح کا نقش ہے۔

کلام پاک کی وسعت کے بارے میں لکھتے ہیں:

علم كلام الله داماء لا ساحل له وطود لا مسلك له وكل واحد اراد وصوله ورام سلوكه درك وما ادرك حده۔ علم الله احاط الكل وهو الملك العلام عالم علومكم واعمالكم وحالكم

کلام اللہ کا علم ایک بے پایاں سمندر ہے جس کا کوئی ساحل نہیں، ایسا بلند ٹیلہ ہے جس کا کوئی راستہ نہیں پا سکتا، جو شخص بھی وہاں تک پہنچنا چاہے اور اس کے پانے کا طریقہ معلوم کرنا چاہے تو اس کی حد کو نہیں پا سکتا، اللہ تعالیٰ کا علم سب کچھ احاطہ کیے ہوئے ہے، وہ ملک العلام اور تمہارے سارے علوم اور اعمال اور تمہارے

---

[1] ص ۱۰

وما آلکمو علوم الکل لوامع علمه — حال اولاد آل کو جانتا ہو اور تمام علوم اس کے

ومعلومهم سواطع معلومه — علم کی ایک کرن اور ان کے معلوم اس کے

(ص۵) — معلوم کا ادنیٰ پرتو ہیں۔

آگے چل کر مختصراً نزول قرآن کا ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کس طرح نازل ہوتی تھی اور آپ کی اس وقت کیا کیفیت ہوتی تھی، اس کے بعد جمع و ترتیب قرآن کے متعلق لکھا ہے اور یہ بتایا ہے کہ کلام مجید میں کل کتنی سورتیں ہیں، ہر سورہ میں کتنی آیات ہیں، قرآن مجید کے بہت سے نام ہیں، ان میں سے جو بے نقط ہیں مثلاً صراط، کلام، امام وغیرہ، اور قرآن مجید کے حفاظ اور اس کے ابتدائی مفسرین حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ کا ذکر کیا ہے، حروف کے صحیح تلفظ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ تمام حروف کو ادا کرنے کا ایک خاص انداز ہے، اس سلسلہ میں بہت سے الفاظ کی تشریح کی ہے مثلاً اللهم، لعل، ام، کاد، لما، لولا وغیرہ۔ اسی طرح سے محکم اور غیر محکم آیات و الفاظ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، محکم وہ ہیں جن کا سمجھنا آسان ہے، اور غیر محکم وہ ہیں جن کا علم سوا اللہ تعالیٰ کے کسی اور کو نہیں، جیسے علم معاد، سورتوں کے ابتدائی الفاظ مثلاً الٓمٓ، الٓرٰ، طٰسٓمٓ وغیرہ۔ اس کے بعد تفسیر سے متعلق اور بھی بعض ضروری باتیں بیان کی ہیں، مقدمہ کے آخر میں دوبارہ بارگاہ خداوندی میں عاجزی و انکساری سے دعا مانگی ہے۔

اللهم اسئلك صوالح الاعمال ومصالح الآمال مادام مر الدهور

وكرّ الاحوال والمامول اصلاح الكلام وهو صالح اولامر الكرام واسلم

مراسم الاسلام وما اصدر ماهو المعهود والمراد معرّداً مورداً

لمدلول كلام الله ومآل كلمه وحاصل اسراره وهو الملهم للسداد

والممد للمداد۔ (ص۲)

مقدمہ خاصا بسیط ہے جس میں مذکورۂ بالا باتیں تفصیل سے بیان کی ہیں، مقدمہ کے دو حصے ہیں، پہلے میں اپنا اور اپنے اعزا کا حال لکھا ہے، دوسرے میں علوم قرآنی کا مفصل تذکرہ ہے۔ ان دو حصوں کو بھی الگ الگ ابواب میں تقسیم کیا ہے، اور ہر باب کا نام ساطعہ رکھا ہے، بعض ساطعے بہت مختصر صرف سطر ڈیڑھ سطر کے ہیں، اور بعض خاصے طویل تیس تیس سطروں تک کے ہیں، مقدمہ کے خاتمہ پر ایک نظم بھی لکھی ہے، اس میں بھی صنعت مہملہ کا التزام رکھا ہے۔

اس کے بعد سورہ فاتحہ کی تفسیر شروع کی ہے تفسیر سے پہلے اس کی اہمیت و عظمت پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

وهو اول السور وصدر كلام الله مطلع مصالح العلم والكلام مصدر مصالح الاوامر والاحكام سلّم مصاعد الحكم والاسرار مدار مصالح الاعمال والاسماء در دور سلسال الارواح والصدور ساحل دماء الهموم والسرور سما دعواء اللمع والحلك" (ص۲)

اسی جگہ پر سورۂ الحمد کے جو دوسرے نام ہیں ان کا تذکرہ بھی کر دیا ہے، اور وجہ تسمیہ لکھی ہے:-

"ولها اسماء احصاها العلماء، احدها الدعاء لما هو مدعوّ اهل الله وهم دعوه لحصول المرام، والاساس لما هو اس الكلام واصله والامّ لما هو حامل لمدلول الكل والحمد لما هو اول كلمها كما حكوا لاسماء السور كلها"

"ايّاك نعبد" کی تفسیر میں لکھا ہے۔

طوعا لاوامرك كما هو مامورك ومرادك وهو حصر الكمال للطوع

والمکوع" (ص ۲۲)

تفسیر میں سورتوں کی شان نزول بھی بیان کی ہے، اور پورے واقعہ کی طرف مختصر اشارہ کردیا ہے، اس سلسلہ میں اگر کوئی خاص قابل ذکر بات ہوتی ہے تو اس کا ذکر بھی کردیتے ہیں، مکی و مدنی کی بھی تصریح کردی ہے۔ مکی سورتوں کا ذکر "موردها مصر رسول الله صلعم" اور مدنی سورہ کا "موردها ام الرحم" کے الفاظ سے کرتے ہیں۔

سورۃ النجم کے متعلق لکھتے ہیں:

"موردها ام الرحم ومحصول اصول مدلولها العهد لسداد ما كلمه الرسول وارساله مما الله وصدع صعوده اسما وكلها السمر المعهود وادكار كلام الاعداء الادم وسوء ماوهموا للاملاك ودماهم ومدح رهط طرحوا الآصار ولوم ماعدل وراء الاسلام وصدع اعطاء اعدال الاعمال معادا واعلاء صروح الادراك لوطود الآسر وطوله والوماء لاحوال الامم الهلاك وهول اهل العالم عما احما مرود السواء وامرهم بطوع الله" (ص ۶۲۵)

سورۃ النصر کے متعلق لکھا ہے:

"موردها مصر رسول الله صلعم ومحصول اصول مدلولها اعلام اسعاد الله رسوله واكمال امداده لاهل الاسلام وسلوكهم مسالك الاسلام رهطا رهطا والامر لحمد الله وسؤال محو الآصار ولهود امد الامر" (ص ۶۲۳)

اسی طرح تمام سورتوں کے شروع میں مختصراً ان کا تعارف کرایا ہے، اور ان کے مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے۔

تفسیری نقطۂ نظر سے اس تفسیر کی اہمیت زیادہ نہیں ہے، اس کی سب سے بڑی وجہ تعقید ہے جو صنعت مہملہ کے التزام کا نتیجہ ہے، اگرچہ فیضی نے بہت کوشش کی ہے کہ کوئی بات تشریح و توضیح سے رہنے نہ پائے، اس کے باوجود بعض عبارتیں بہت مشکل ہوگئی ہیں، عام طور سے لوگوں نے اس تفسیر کو ایک بے مقصد اور فضول کام کہکر اپنی جان بچالی ہے، لیکن اسکو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حقیقۃً ایسا نہیں ہے۔

سورۂ آل عمران میں محکم و متشابہ آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

هو الله الذی انزل ارسل علیك محمد الکتٰب المعهود المعلوم اسماً ورسماً منه السطرس لمعلوم المعهود آیٰت محکمٰت محکم کلمها واحکامها مؤکد دوالها مصرح مدلولها والمراد ما امره الله وسطکل طرس ارسله اوکلام ما حل الا محلا واحدا والحاد لحکمها هن اولاء ام الکتٰب اصله ومرده ماوراء ها واخر ماعداها متشٰبهٰت لاسالك لادراك مرادها ومدلولها کطالع السور وکلها اما اول ما صرح الله مرامه اوما لا امره الله وسط کل طرس اوماله محامل اوالحدود۔“

پورے قرآن مجید کی تفسیر کا یہی انداز ہے، عبارتوں میں اختصار اور معانی و مفہوم کو سہل انداز پر بیان کرنے کی کوشش کی ہے لیکن چونکہ تفسیر سے زیادہ صنعت گری پیش نظر ہے، اس لیے اسکو سمجھنا خاصا مشکل ہوگیا ہے، ملا بدایونی وغیرہ نے اس تفسیر کی مخالفت محض رشک و حسد کی بنا پر کی ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ اگر فیضی نے اس کو صنعت مہملہ میں نہ لکھا ہوتا تو اس کے خیالات زیادہ

واضح ہوتے، اور لوگوں کو جو غیر منقوطہ عبارات کی بدعت نظر آتی ہے فیضی اس سے بچ جاتا، لیکن فیضی غالباً کلام اللہ کے اس معجزہ کو بھی دکھانا چاہتا تھا کہ اس کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے مختلف انداز اختیار کیے جا سکتے ہیں، حتی کہ اس کی تفسیر غیر منقوطہ الفاظ میں بھی لکھی جا سکتی ہے، اسکے علاوہ عربی زبان پر اپنی قدرت کا ثبوت دینا چاہتا تھا، لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب الفاظ کا سرمایہ محدود ہو تو تعقید کا پیدا ہونا قدرتی بات ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تفسیر کا مفہوم ہی خبط ہو گیا ہے، ایسا نہیں ہے، جہاں سے اس کو پڑھا جائے مطلب سمجھ میں آجاتا ہے،

فیضی نے جب یہ تفسیر لکھی اس وقت کسی نے اس کی زبان یا مطالب پر اعتراض نہ کیا، بلکہ صرف غیر منقوطہ کی بدعت پر اعتراض تھا، اسی بنا پر اس کو بدعتی قرار دیا گیا۔

فیضی کی یہ تفسیر کم و بیش ساڑھے سات سو صفحات پر ہے لیکن اس ضخیم کتاب میں کہیں بھی کوئی قابل اعتراض بات نظر نہیں آتی، اکبری دور میں جبکہ دربار کا رنگ بالکل غیر مذہبی تھا فیضی اس تفسیر کو لکھنا کوئی معمولی بات نہ تھی، یہ محض اس کا مذہبی جذبہ تھا کہ اس نے اتنا بڑا کام کر ڈالا اگر اس تفسیر سے اس کو کوئی دنیاوی فائدہ، یا درباری رتبہ بڑھانا یا بادشاہ کا تقرب حاصل کرنا مقصود ہوتا تو یقیناً اس نے اس میں دوسرے قسم کے خیالات ظاہر کیے ہوتے۔

اس تفسیر کی مذمت صرف ملا بدایونی کے یہاں ملتی ہے، اور جن لوگوں نے اس کے بارہ میں لکھا ہے، انہی کے حوالہ سے لکھا ہے، فیضی نے تفسیر لکھنے کے بعد اس کے نسخے مختلف ملکوں میں بھیجے تھے، اور روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ سب نے اس کو پسند کیا، کسی نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا، اس زمانہ کے متعدد بڑے علماء نے تقریظیں لکھیں اور تاریخیں کہیں، جو اس تفسیر کے آخر میں درج ہیں، ان علماء میں محمد حسینی المشہور بہ ہاشمی، مولانا یعقوب صیرفی کشمیری، قاضی نور اللہ شوستری، امان اللہ ابن غازی سرہندی وغیرہ کے نام ہیں، طوالت کے خیال سے انکی رائیں تفسیر کے بارہ میں نقل

نہیں کیں۔ بعض روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مجدد صاحب نے بھی اس تفسیر کی بیاض میں مدد کی تھی، اور اس کا ایک مشکل حصہ جو فیضی نہیں لکھ سکتا تھا، مجدد صاحب نے لکھ کر دیا تھا[1] جو اس کا ثبوت ہے کہ حضرت مجدد صاحب کی نظر میں بھی فیضی کی یہ کوشش قابل اعتراض نہ تھی۔

مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنی کتاب نظام تعلیم و تربیت میں بہت تفصیل سے فیضی اور اسکی تفسیر کے متعلق خیالات ظاہر کیے ہیں، یہاں ان کی رائے نقل کیجاتی ہے:

"میرا خیال ہے کہ یہ ایسا کارنامہ ہے جس کی نظیر شاید دوسرے اسلامی ممالک کے علمی حلقوں میں نہیں مل سکتی، مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غیر منقوطیت کے اس التزام کے باوجود ملانے یہ کمال کیا ہے کہ عام تفسیروں میں قرآنی آیات کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس شخص نے ان تمام امور کے سمیٹنے کی جہاں تک میرا خیال ہے ایک کامیاب اور ایسی کوشش کی ہے جس کی نظیر اس سے پہلے مشکل ہی سے مل سکتی ہے، گو اس کی تفسیر میں مطالب کے لحاظ سے کوئی جدت نہیں ہے تاہم بہرحال ایک غیر معمولی ذہن و دماغ کا آدمی تھا، بیچ بیچ میں بعض نکتے اس کے قلم سے بے ساختہ نکل گئے ہیں، اگر ان کو ایک جگہ جمع کیا جائے تو بھی خاصی چیز ایسی جمع ہو سکتی ہے جسے اس کی تفسیر کی معنوی خصوصیت بھی قرار دیا جا سکتی ہے۔"[2]

---

[1] زبدۃ المقامات ص ۱۳۲

[2] نظام تعلیم و تربیت (ج ۲) غالباً فیضی کی ہی تفسیر سے متاثر ہو کر ۱۳۲۲ھ میں شام کے ایک عالم سید محمود آفندی نے درر الاسرار کے نام سے ایک غیر منقوطہ تفسیر لکھی جو شائع بھی ہو گئی ہے، فیضی کی اور ان کی تفسیر میں فرق اتنا ہے کہ فیضی ذرا تفصیلی انداز اختیار کرتے ہیں لیکن محمد آفندی اختصار۔ ورنہ ان کا سرمایہ کم و بیش ایک ہی ہے، اس کے علاوہ کسی دوسری غیر منقوط مکمل تفسیر کا پتہ نہیں چلتا ہے، اس طرح سے فیضی اس میدان کا پہلا شہسوار ہے اور ہندوستان پہلا ملک جہاں ایسی تفسیر لکھی گئی۔

فیضی کی یہ تفسیر ہر اعتبار سے مکمل اور خاصی اہم ہے، اور اسے کسی بھی دوسری تفسیر کے مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے۔ تفسیری خوبیوں کے ساتھ ساتھ یہ ایک قابل قدر علمی وادبی کارنامہ بھی ہے' فن تفسیر کے نقطۂ نظر سے اس میں کسی قسم کی خامی نظر نہیں آتی، البتہ کتاب کا مقدمہ خاصا مشکل ہے، خاص طور سے وہ جہاں وہ لوگوں کے نام اور اسی قسم کی دوسری باتیں بیان کرتا ہے۔ لیکن اصل تفسیر کا حصہ مشکل نہیں ہے، تھوڑی توجہ اور محنت سے مطالب سمجھ میں آجاتے ہیں،

اس تفسیر سے عربی زبان کی حیرت انگیز سرمایہ داری کا بھی ثبوت ملتا ہے جس میں خدا کا آخری پیغام نازل ہوا، اور اس پر فیضی کی قدرت اور کمال انشاء کا بھی۔ ہندوستانی مفسرین کے کارناموں میں یہ کتاب ایک بڑا اہم کارنامہ ہے جس پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔

امام رازی

امام فخرالدین رازی کو جو جامعیت حاصل تھی، اس کا تقاضا تھا کہ ان پر ایک مستقل کتاب لکھی جاتی اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے، جس میں ان کے سوانح وحالات اور تصنیفات کی تفصیل کے ساتھ فلسفہ وعلم کلام اور تفسیر کے اہم مسائل کے متعلق ان کے نظریات وخیالات کی تشریح کی گئی ہے۔ جو لوگ قرآن مجید پر خالص فلسفیانہ حیثیت سے غور وفکر کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ کتاب مشعل ہدایت کا کام دے سکتی ہے۔

مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

ضخامت ۲۸۰ صفحے   قیمت سے ۹/

منیجر

مشائخ گردیزیہ کا تعلق اضلاعِ مشرقی سے

از جناب قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

ساتویں صدی ہجری کے شروع میں سلطان شمس الدین التمش متوفی ۶۳۳ھ کے دورِ سلطنت میں ترکستان کے شہر گردیز سے جو نواحِ بخارا میں ہے، دو بھائی دہلی آئے، ایک سید شمس الدین اور دوسرے سید شہاب الدین، کچھ دنوں کے بعد دونوں بھائیوں نے پھر رختِ سفر باندھا، سید شمس الدین نے دہلی کے قریب ہی علاقۂ میوات کو اپنی منزل قرار دیا، جہاں ان کی اولاد پھلی پھولی اور آباد ہوئی، اور سید شہاب الدین نے دہلی سے دور بہ سمت مشرق مانک پور میں اقامت اختیار کی، جہاں انکو اور ان کی نسل کو بڑا فروغ ہوا، امارت و شیخت اور دین و دنیا کے امتزاج نے ان کے قدم چومے، شاہی منصب، جاگیرداری اور زمینداری نے ان کا استقبال کیا، آگے چل کر روحانیت و شیخت نے بھی ان کو حسن قبول بخشا، امراء و سلاطین سے لیکر عوام تک ان کے قدردان بن گئے، راجہ کا خطاب ان کو پہلے ہی عوام سے مل چکا تھا، اب شیخ اور شاہ کا خطاب بھی مل گیا، ان ساداتِ گردیزیہ کو سرزمین مانک پور بہت راس آئی، ایک طرف انھوں نے سلاطین وقت سے بڑے بڑے عہدے اور دوسری طرف مشائخِ زمانہ سے فیوض و برکات حاصل کیے، اور ظاہری معنوں میں بھی "آنانکہ در فقیری شہنشاہی کردہ اند" کے مصداق بن گئے۔

پھر ان کی یہ فقیری و شہنشاہی صرف حدود مانک پور تک نہیں رہی، بلکہ بعد میں اس خاندان کے گوہر شب چراغ راجہ سید حامد شاہ مانک پوری نے حضرت شیخ حسام الدین مانک پوری متوفی ۸۵۱ھ

کی صحبت و خدمت میں رہ کر ہوا، امارت و مشیخت کا دائرہ اور وسیع کر کے مشرق کی طرف ایک اور قدم بڑھایا، اور جونپور کو مرکز بنا کر بلاد پورب کو اپنے زیرنگیں کیا، اور یہاں سادات گردیزیہ کا وہ اثر و اقتدار ہوا کہ سلاطین شرقیہ، سلاطین لودی اور سلاطین تیموری کی حکومتوں میں انقلاب آتے رہے، مگر ان کا دربار برابر جاری رہا، اور سلطنتوں کے انقلاب میں ان کے فیوض و برکات کا مینارہ برابر روشنی پھیلاتا رہا۔

آیندہ صفحات میں مانک پور کے ان ہی مشائخ گردیزیہ اور بلاد پورب میں ان کے دینی و روحانی کارناموں کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سید شہاب الدین گردیزیؒ | جیسا اوپر معلوم ہو چکا ہے، آپ اپنے بھائی سید شمس الدین کے ساتھ سلطان شمس الدین التمش متوفی ۶۳۳ھ کے زمانہ میں گردیز سے دہلی تشریف لائے، آپ کا سلسلۂ نسب یہ ہے: سید شہاب الدین بن زین الدین بن عیسیٰ باقر بن نظام الدین ابوالعلی محمد بن ابوطالب حمزہ بن محمد ابن طاہر بن امام جعفر زکی النفس[1]۔ سید شاہ ابوالحسن نے آئینۂ اودھ میں ابوطالب حمزہ بن سید جعفر ابن سید امام نقی لکھا ہے[2]، شاہ عبدالحق صاحب دہلویؒ نے اخبار الاخیار میں راجہ سید حامد شاہ کے تذکرہ میں لکھا ہے:

> "در زمان سلطان شمس الدین التمش[2] دو برادر از سادات گردیز بہ دہلی قدم آوردہ بودند یکے سید شمس الدین در زمین میوات سکونت کرد، و بقیہ اولاد او در آنجا ماندہ اند، و دیگر سید شہاب الدین کہ اجداد راست، بزرگان ایشان معزز و مکرم بودہ اند، و در زبان مردم آں دیار بر ایشان اسم راجی غالب آمدہ"[3]

مفتی غلام سرور لاہوری نے خزینۃ الاولیاء میں لکھا ہے "و اسم راجی خطاب سید شہاب الدین کہ جد راجی حامد شاہ بود"[4]

---

[1] خزینۃ الخواطر ص ۱۰، [2] آئینہ اودھ ص ۱۰، مطبع نظامی ۱۲۹۶ھ [3] اخبار الاخیار ص ۱۴۹، [4] خزینۃ الاصفیاء جلد اص ۴۰۹ مطبع ثمر ہند لکھنؤ ۱۳۰۲ھ

آئینۂ اودھ میں ہے کہ آپ بحکم باطن ساکن مانک پور ہوئے بعض گردیزی راویوں کے بیان کے مطابق آپ کو حکومت سے منصب سلطانی اور مانک پور کی جاگیر ملی، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اتنی اولاد دی کہ ان سے کئی مواضعات آباد ہوگئے۔ اور سلاطین جونپور کے زمانہ میں بڑا اقتدار حاصل ہوا، ایسا اقتدار ظاہری و باطنی دوسرے سادات کو حاصل نہیں ہوا، آپ کا مزار پہلے مانک پور میں لب دریا تھا۔ بعد میں دریا برد ہونے کے خوف سے آپ کی اولاد نے آپ کی نعش کو آراضی شہاب الدین پور میں دفن کیا جہاں آپ کا روضہ اب تک موجود ہے[1]۔

سید شرف الدین اور سید عزالدین | سید شہاب الدین کے یہ دونوں صاحبزادے ظاہری اور باطنی کمالات کے جامع اور اپنے باپ کے صحیح جانشین تھے، ان کو حضرت مخدوم جہانیاں سید جلال الدین حسین بخاری متوفی ۷۸۵ھ کی توجہ نے خصوصی فیض بخشا، سلطان الشرق خواجہ جہاں سرور، متوفی ۸۰۲ھ کے دور حکومت میں آپ مانک پور تشریف لے گئے، جو جونپور سے اسی میل دور ہے اور شرقی سلطنت میں شامل تھا، سید شرف الدین اور سید عزالدین (یا عزیزالدین) نے حضرت مخدوم جہانیاں کا ان کے شایان شان استقبال کیا، اور ان کو مہمان بنا کر خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، مخدوم صاحب نے ان سے دریافت کیا، کیا بات ہے کہ آپ لوگوں میں بعض اسلحہ بند ہیں اور بعض خرقہ پوش ہیں؟ انھوں نے عرض کیا کہ سلاطین و حکام کی طوائف الملوکی کی وجہ سے غیر مسلم موقع پا کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ اسی لیے ہم لوگ ہتھیار بند رہا کرتے ہیں، مخدوم صاحب نے سید عزالدین کو خطاب کرکے فرمایا کہ تم سراجہ ہو اور سید شرف الدین سے فرمایا کہ تمھارے لیے عہد قضا ہے۔ اب تم کو کوئی متمرد تکلیف نہ دے سکے گا۔ بشرطیکہ تم لوگ اپنے آباء و اجداد کے دین پر رہ کر کتاب سنت کی اتباع کرو، اگر تم اس پر قائم رہے تو یہ دونوں باتیں تم سے ختم نہیں ہوں گی، جب مخدوم صاحب مانک پور سے واپس ہوئے

---

[1] آئینۂ اودھ ص ۱۶۸

تو یہ دونوں بھائی پرگنہ پرتاب گڈھ تک ہمراہ آئے۔[۱] سید علی موسوی حیدرآبادیؒ نے مشکوٰۃ النبوۃ میں لکھا ہے کہ

"سید عزالدین جد شریف سید حامد شاہ سجادہ نشین آبا خود بودند"

پھر اودھ کے واقعہ کو اختصار کے ساتھ نقل کیا ہے، اور اس میں صرف سید عزالدین کا نام لیا ہے،

"در زمانے کہ مخدوم جہانیاں سید جلال الدین حسین بخاری سیاحت دیار شرق نمود، با سید عزالدین کہ از مشاہیر مشائخ بود بملاقات نمودہ معائنہ فرمود کہ سید لباس مشائخانہ ندارد وسلاح می بندد، مخدوم پرسید کہ سبب سلاح بستن چیست، سید گفت دریں ملک راجہائے اہل فساد بر مسلمانان آفت می کنند، مخدوم فرمود کہ از امروز ولایت بر شما باشد، الحال شما راجہ ایں ملک شدید، پس ازاں روز خطاب راجہ بر اولاد ایشان جاری شد"۔[۲]

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سید عزالدین اپنے والد شہاب الدین کے خلیفہ اور جانشین تھے، اور مخدوم جہانیاں نے ان کو ہی راجہ کا خطاب دیا تھا، جو بعد میں رواج پایا،

راجہ سید حامد شاہ مانک پوری متوفی سنہ ۸۰۱ھ

آپ سید عزالدین (یا عزیز الدین) کے پوتے ہیں، حسینی اور رضوی کی نسبت سے مشہور ہیں، آپ نے مانک پور کے سادات گردیزیہ کی تاریخ میں ایک نیا روحانی موڑ پیدا کیا، اور دہلی ثانی جونپور کو سرزمین چشت بنا دیا، راجہ سید حامد شاہ حضرت شیخ حسام الدین مانک پوری متوفی سنہ ۸۵۳ھ کے اجل خلفاء میں سے ہیں، آپ کے والد درویش صفت بزرگ تھے، بچپن ہی ہی میں شیخ حسام الدین کی صحبت و خدمت میں رہ کر سلوک و معرفت کی منزلیں طے کیں، اور طریقہ چشتیہ میں کمال کو پہنچے، اور عین جوانی میں اپنے شیخ و مرشد کے حکم سے جونپور آئے، جہاں سلاطین و علماء اور عوام سب نے بڑھ کر استقبال کیا۔ اس کا نقشہ صاحب مشکوٰۃ النبوۃ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

"در وقت شباب ارشاد نامہ باسم وے نوشتہ بطرف جونپور رخصت، و او در آں مرکب بار

۱؎ آئینہ اودھ ص ۱۶۸، ۲؎ مشکوٰۃ النبوۃ قلمی ص ۳۴۳، مولفہ قاضی احمد جاجکپوری۔

ساخت، وخود بہیئت مفاخرت او پیادہ ہمراہ او برآمد، تا بیرون شہر مانکپور ایں بیت بزبان می راند

میروی تو در رکاب و میرود جان حسام ۔۔۔ فی امان اللہ برو، فاللہ خیر حافظا

پس چوں راجی حامد شاہ با کمال ولایت و تصرف در جونپور داخل شد، غلغلۂ سید در شہر و نواحی آنجا در افتاد، و تمام خلق آں دیار روئے نیاز بدو آوردند، واکثر شہرت ارادتش در آمدند مثل شیخ الہداد، و شیخ بہاء الدین جونپوری وغیرہ[1]

راجہ سید حامد شاہ شیخ حسام الدین کی صحبت میں آنے سے پہلے اپنے خاندان والوں کی طرح سپاہیانہ لباس میں رہتے تھے، کچھ زیادہ لکھے پڑھے نہیں تھے، مگر صفائی باطن اور روحانی فراست کا یہ حال تھا کہ فضلائے زمانہ آپ کے حلقہ میں آکر علم و معرفت سے محظوظ ہوتے تھے۔ خزینۃ الاولیاء میں ہے،

"و راجی حامد شاہ در اوائل حال بلباس سپاہیاں می ماند، آخر بصحبت شیخ حسام الدین مانکپوری مشرف شد، و ریاضات شاقہ کشید و صفائے باطن و حضور قلب نصیب او گردید و ذہنی از علم ظاہر بقدر رامحتاج کفایت کردہ بود، لیکن دانشمندان دہر، و علمائے عصر اسیر حلقۂ ارادت او بودند۔"[2]

آپ کی وفات ۲۵ شعبان سنہ ۹۰۰ھ میں مانک پور میں ہوئی اور مزار بھی وہیں ہے۔

یوں تو آپ کے بہت سے خلفاء تھے، ان میں پانچ بہت مشہور ہیں، جن کے ذریعہ بلاد پورب میں فیوض و برکات کا دریا جاری ہوا، (۱) آپ کے صاحبزادے راجہ سید نور متوفی سنہ ۹۲۱ھ (۲) مولانا شیخ حسن بن طاہر جونپوری متوفی سنہ ۹۰۹ھ (۳) مولانا شیخ الہداد جونپوری متوفی سنہ ۹۲۳ھ (۴) مولانا شیخ بہاء الدین جونپوری متوفی سنہ ۹۱۱ھ (۵) مولانا شیخ دانیال بن حسن جونپوری متوفی سنہ ۹۰۲ھ رحمہم اللہ۔

راجہ سید نور بن راجہ سید حامد مانکپوری متوفی سنہ ۹۲۱ھ | آپ کو نور الحق اور نور الدین بھی کہتے ہیں، مگر نور کے نام سے

---

[1] مشکوۃ النبوۃ ص ۱۶ و [2] خزینۃ الاولیاء ج ۱ ص ۴۰۹

زیادہ مشہور ہیں، اپنے والد کے خلیفہ اور سجادہ نشین اور صاحب کشف وکرامات بزرگ تھے، جب آپ پیدا ہوئے تو راجہ حامد شاہ کے مرشد و شیخ حسام الدین نے ان کو بشارت دی کہ یہ بچہ آگے چل کر قطب وقت ہوگا، راجہ حامد شاہ نے بچپن ہی سے ان کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ فرمائی اور عنفوان شباب میں تمام ظاہری و باطنی علوم اور سلوک و معرفت سے بہرہ مند کردیا، اور جب راجہ حامد شاہ کا وصال ہوا تو راجہ نور نے ان کی جگہ سنبھالی، باپ کی طرح آپ بھی امیرانہ اور سپاہیانہ لباس زیب تن فرماتے تھے، شاہ عبد الحق دہلوی لکھتے ہیں: "او نیز مثل پدر بزرگ و صاحب کرامت بود و لباس سپاہ گری را غشاوہ حال و مشغولی باطن ساختہ"[1]، مولانا عبد الصمد ابن افضل احمد انصاری نے اخبار الاصفیاء میں لکھا ہے: "راجی نور الدین قدم ہمت و کلبہ فقر و فنا فشردہ، چند پایہ از پدر بلند تر رفت، و چند خلفاء و مریدان یادگار گذاشتہ"[2] اور مفتی غلام سرور لاہوری نے خزینۃ الاولیا میں لکھا ہے: "راجی سید نور کہ از سادات نور علی نور و اولیا عظام است"[3]

راجہ سید نور شاہ نے بعہد سکندر لودی ۹۲۰ھ میں مانک پور میں انتقال فرمایا، آپ کا مزار خانقاہ مانک پور کی سرحد پر ہے، اکبر کے زمانہ میں اس پر روضہ اور گنبد تعمیر ہوا، آپ کی اولاد میں راجہ سید احمد ہیں، جن کا نام شیخ محمد غوثی نے گلزار ابرار میں محمود بتایا ہے، مگر ان کے حالات نہیں ملتے،

راجہ نور کے تین خلفاء بہت مشہور ہیں، جن سے بلاد پورب میں علم و معرفت کی بہت سی انجمنیں آباد ہوئیں، (۱) شیخ دیتن بن احمد جونپوری متوفی سنہ ۹۴۰ھ (۲) شیخ جلال الدین بن عبد اللہ اودھی متوفی سنہ ۹۶۰ھ (۳) شیخ نظام الدین امیٹھوی متوفی سنہ ۹۷۹ھ۔

راجہ سید مبارک بن راجہ سید احمد بن راجہ سید نور مانک پوری بانی مبارک پور

آپ راجہ سید نور کے پوتے اور راجہ سید احمد کے بیٹے ہیں، افسوس ہے کہ تلاش بسیار کے باوجود آپ کے حالات

---

[1] اخبار الاخیار [2] اخبار الاصفیاء قلمی ورق ۸۳ مملوکہ قاضی اطہر مبارکپوری [3] خزینۃ الاولیاء ج ۲ ص ۴۰۹

دل سکے، البتہ مشائخ گردیزیہ کے سلسلۂ نسب میں ان کا نام متعدد جگہ موجود ہے، مثلاً نزہۃ الخواطر میں ان کے پوتے راجہ سید احمد بن مجتبیٰ مانک پوری کے ذکر میں گنج ارشدی کے حوالے سے یوں درج ہے:

الشیخ الصالح احمد بن مجتبیٰ بن مبارک بن احمد بن نور بن الحامد الحسینی الرضوی المانکپوری۔[1]

شیخ محمد غوثی نے گلزار ابرار میں راجہ سید مبارک کے بیٹے راجہ سید مصطفیٰ کے ذکر میں یوں لکھا ہے،

راجی سید مصطفیٰ بن سید مبارک بن سید محمود (احمد صحیح ہے) بن سید نور بن سید حامد شاہ۔[2]

نیز غوثی نے راجہ سید مصطفیٰ کے نسبتی بھائی شیخ اویس بن غوث الاولیاء کے ذکر میں راجہ سید مبارک کا نام یوں لیا ہے، "غوث، خسر مصطفیٰ بن مبارک"۔[3]

آئینۂ اودھ میں راجہ سید نور کے ذکر کے آخر میں ان کا نام یوں آیا ہے، "پسران کے (راجہ سید نور کے) سید احمد، ان کے سید مبارک، ان کے راجی سید بندگی الخ"[4]

اعظم گڈھ گزیٹیر ۱۹۱۱ء میں قصبہ مبارک پور کے ذکر میں راجہ سید مبارک کا تذکرہ یوں ہے:

"کہا جاتا ہے کہ اس قصبہ کا نام پہلے قاسم آباد تھا، بعد میں راجہ مبارک کے نام سے آباد ہوا، جو کڑا مانک پور کے ایک روحانی بزرگ تھے۔"[5]

راقم الحروف کو فارسی زبان میں ایک قلمی رسالہ ملا ہے، جس سے ان کے بارے میں چند باتیں معلوم ہوتی ہیں، اس کے سرنامہ پر یہ عبارت درج ہے:

"جواب خط سید مبارک محمد آبادی کہ جناب مولانا حاجی محمد علی صاحب نوشتہ بودند ادام اللہ"

اس کے بعد اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۵۹ [2] اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار ص ۲۰۳ مطبع مفید عام آگرہ [3] ایضاً ص
[4] آئینۂ اودھ ص ۲۰۲ [5] اعظم گڈھ گزیٹیر ۱۹۱۱ء ص ۲۶۱

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ بخدمت راجی مبارک علی صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ۔ از طرف فقیر محمد علی عفی عنہ۔ بعد سلام سنت الاسلام، آنکہ سوال از اثبات امامت و وصایت کرفرمودہ بودند معلوم نمایند کہ وصایت و امامت دوازدہ امام علی نبینا و علیہم الصلوٰۃ والسلام بنزد اہل سنت وجماعت ثابت و متحقق ست، نہ باین معنی کہ شیعہ می گویند بلکہ بمعنی دیگر ست۔ چرا کہ شیعہ لفظ امامت می گویند، و از آں مراد نبوت می دارند، و دوازدہ امام را احکام نبوت ثابت میکنند از نزول وحی و تحریم و تحلیل وغیرہ کہ در کتب این فرقہ مسطور است الخ" (ص ۱)

یہ رسالہ ۸۰ صفحات میں ہے، ہر صفحہ میں پندرہ سطریں ہیں، افسوس کہ اس کا آخری ورق غائب ہے، اس کی ان ابتدائی عبارتوں سے ہم حسب ذیل نتائج نکال سکتے ہیں :

جس زمانہ میں راجہ سید مبارک نے مولانا محمد علی سے زبانی یا تحریری سوال کیا تھا، اس سے بہت پہلے وہ انگ پور سے آکر پرگنہ محمد آباد یا خاص قصبہ محمد آباد میں آباد اور یہاں مستقل قیام کی وجہ سے محمد آبادی مشہور ہو گئے تھے، اور غالباً قصبہ مبارک پور کو اپنے نام پر آباد کرکے یہیں رہتے تھے، اور چونکہ قصبہ مبارک پور اس زمانہ میں پرگنہ محمد آباد میں تھا، جیسا کہ اب بھی ہے، اور نیا نیا آباد ہوا تھا، اس کی کوئی خاص شہرت نہیں تھی، اس لیے وہ محمد آبادی ہی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ جس طرح اس زمانہ میں اس علاقہ کے مختلف مقامات کے علماء جونپوری مشہور ہوئے۔ اور یہ قاعدہ بھی ہے کہ کسی بڑی بستی یا شہر کے قرب و جوار کے لوگ اسی کی نسبت سے مشہور ہوتے ہیں۔

مولانا محمد علی نے اپنے جواب کی ابتدا میں ان کو راجی مبارک علی کے نام سے یاد کیا ہے، مگر ان کا نام اور ہر جگہ صرف راجہ سید مبارک ملتا ہے، ممکن ہے علی کا اضافہ دیار پورب میں مستقل بودوباش کے بعد ہوا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے ہی سے بطور اختصار کے مبارک مشہور ہو گیا ہو، جس طرح ان کے دادا راجہ سید نور کا پورا نام اخبار الاصفیا میں تین مقامات پر راجی نور الدین آیا ہے،

اور نزہۃ الخواطر میں گنج ارشدی کے حوالہ سے نور الحق ہے، مگر وہ صرف راجہ سید نور کے نام سے مشہور تھا۔

اس رسالہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ راجہ سید مبارک کو علوم دینیہ سے حصۂ وافر ملا تھا، اور وہ علمی و دینی مسائل و مباحث میں معاصرین سے تعلق رکھتے تھے، اور سنی المسلک تھے، افسوس کہ مولانا حاجی محمد علی صاحب کے حالات نہیں مل سکے ورنہ سائل اور مجیب دونوں کے بارے میں کچھ اور معلومات حاصل ہوتے۔

راجہ سید مبارک کا سنہ وفات تک معلوم نہ ہو سکا۔ اور نہ ان کے دور کی تعیین ہو سکی، ان کے دادا راجہ سید نور نے سکندر لودھی کے زمانہ میں ۹۲۱ھ میں وفات پائی، اور ان کے بیٹے راجہ سید مصطفیٰ ۹۸۴ھ میں اکبر بادشاہ کے ہمراہ مالوہ گئے تھے، اور پوتے راجہ احمد بن مجتبیٰ بن مبارک ۱۰۴۰ھ میں فوت ہوئے۔ ان سنین وفات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ راجہ مبارک دسویں صدی ہجری کے وسط میں ضرور رہے تھے، اور اسی دوران میں انھوں نے قصبہ مبارک پور (اعظم گڈھ) آباد کیا، اور اپنے آبا و اجداد کی طرح دیار پورب میں رہنے کے باوجود مانک پور سے تعلق رکھا۔ اور وہیں انتقال کیا اور مزار بھی وہیں ہے۔

راقم الحروف کا خاندان مانک پور کا تھا۔ جسے راجہ سید مبارک اور مشائخ گردیزیہ سے روحانی اور دینی تعلق تھا، راجہ سید مبارک نے اس کو اپنے ساتھ لا کر مبارک پور میں آباد کیا تھا، آپ کی یادگار قصبہ مبارک پور کی جامع مسجد ہے، جو "راجہ صاحب کی مسجد" کے نام سے مشہور ہے، اور اس کے علاقہ کو "راجہ صاحب" کہتے ہیں، یہ مسجد ۲۲ دروں کی تھی، اتنی بڑی مسجد اس علاقہ میں دوسری نہیں تھی، چند سال ہوئے لوگوں نے اسے منہدم کر کے اسی جگہ دوسری عالیشان مسجد کی بنیاد رکھی جو ابتک نامکمل ہے، اس مسجد کے شمالی جانب ایک احاطہ ہے جس میں ایک ثناتی دار چھوٹی سی مسجد ہے، یہی دراصل راجہ مبارک کی مسجد ہے، اسی احاطہ میں ان کی مصنوعی قبر بھی ہے، ہمارا

آبائی مکان اسی احاطہ کے پاس تھا، مبارک پور آباد ہونے کے بعد دار القضاء، پرگنہ محمد آباد گوہنہ سے متعلق رہا، اور یہاں کی نیابت قضا کا عہدہ راقم الحروف کے خاندان کے سپرد ہوا، اس سلسلے کے کئی شاہی فرامین اور اسناد ابتک ہمارے یہاں محفوظ ہیں، مبارک پور کے قریب ہی مغرب میں سرائے مبارک نامی ایک بستی ہے، غالباً یہ بستی بھی راجہ سید مبارک ہی کے نام پر اسی زمانہ میں آباد ہوئی تھی،

مشائخ گردیزیہ نے مانک پور کے قرب وجوار میں بازید پور، اونچہ گاؤں، مصطفیٰ آباد، رسولپور اور شہاب الدین پور نامی بستیاں آباد کی تھیں، ہمارا خیال ہے کہ قصبہ مبارک پور کے قریب شمال مغرب میں مصطفیٰ آباد، اور شمال مشرق میں رسول پور نامی مسلم بستیاں بھی راجہ مبارک کے دور میں آباد ہوئیں، اور مصطفیٰ آباد کا نام ان کے صاحبزادے راجہ سید مصطفیٰ کے نام پر رکھا گیا، اس طرح انھوں نے نواح مانک پور سے لیکر حدود جونپور تک اپنے روحانی فیض و برکات کے ساتھ تعمیری آثار بھی ثبت کیے، راجہ مبارک کی اولاد کے بارے میں اعظم گڈھ گزیٹیر میں ہے:

"وہ مبارک پور کے موجودہ شیوخ زمینداروں کے مورث اعلیٰ تھے"[1]

جو صحیح نہیں ہے، یہاں ان کی اولاد کے رہنے اور بسنے کا پتہ نہیں چلتا، البتہ ہمارا خاندان جسے راجہ مبارک اپنے ہمراہ مانک پور سے لائے تھے، یہاں آباد ہوکر یہاں کی نیابت قضا کا عہدہ سنبھالتا راجہ سید مبارک کے دو صاحبزادے راجہ سید مصطفیٰ اور راجہ سید مجتبیٰ کے نام اور حالات کتابوں میں ملتے ہیں، مگر ان کے مبارک پور میں مستقل قیام کی کوئی روایت یا سند نہیں ملتی۔

راجہ سید مصطفیٰ بن راجہ سید مبارک: آپ عہد اکبری کے باکمال علماء و مشائخ میں تھے، اور امارت و مشیخت دونوں میں ممتاز تھے، آئینۂ اودھ میں غالباً ان ہی کو راجہ سید مبارک کے پسر راجہ سید بندگی لکھا ہے[2] محمد غوثی نے گلزار ابرار میں راجہ سید مصطفیٰ کا مستقل تذکرہ کیا ہے، اور ایک جگہ ان کے نسبتی بھائی شیخ

---

[1] اعظم گڈھ گزیٹیر ۱۹۱۱ء ص ۱۶۱ [2] آئینۂ اودھ ص ۲۸۲

اویس بن غوث الاولیاء کے ذکر میں، غوثی نے خسر مصطفیٰ بن مبارک لکھا ہے، یہ بھی لکھا ہے کہ راجہ سید مصطفیٰ کے پدر بزرگوار کا نام سید مبارک بن سید محمود (احمد) بن سید نور بن سید حامد شاہ ہے، وہ سید حامد شاہ شیخ حسام الدین مانک پوری کے خلیفۂ اعظم ہیں، راجہ مصطفیٰ کے اخلاق درویشانہ اور اطوار صوفیانہ تھے، آپ کی نزاکت طبع ناموافق چیزوں کو برداشت نہیں کر سکتی تھی، زندگی کمال ظریفانہ طور پر بسر کرتے تھے، ظاہری پاکیزگی اور باطنی صفائی آپ کے خمیر میں داخل تھی۔ سرود وسماع سے دلچسپی رکھتے تھے، مگر اس میں صرف کمال فن سے محظوظ ہوتے تھے، غوث الاولیاء کی خدمت میں دامادی کی نسبت تھی، اور قطب الاقطاب کی لڑکی سے کئی فرزند تھے، جن میں سے ایک راجہ سید محمد ہیں، جو اپنے پدر بزرگوار کے جانشین ہیں، اللہ تعالیٰ سب فرزندوں کو اجداد کے کمالات پر پہنچائے۔ ۹۸۴ھ میں عرش آشیانی اکبر شاہ کا لشکر دار الخلافہ آگرہ سے مالوہ کی طرف آیا، اور تمام مشائخ، فقراء، فضلاء، قضاۃ اور شعراء لشکر کے ہمراہ تھے، راقم (محمد غوثی مصنف گلزار ابرار) نے جب یہ خبر سنی تو بیتاب ہو کر ان کی زیارت کرنی چاہی، اور میں بھی جو بزرگان شہر (مانڈو یا برہانپور) سیر لشکر کے لیے روانہ ہوئے، ان کے ہمراہ ہو گیا، اسی سلسلے میں راجہ سید مصطفیٰ کے دیدار سے ظاہری اور باطنی آنکھیں منور ہوئیں۔[1]

راجہ سید محمد بن راجہ سید مصطفیٰ ابن راجہ سید مبارک جیسا کہ غوثی کے بیان سے معلوم ہوا، آپ اپنے والد راجہ سید مصطفیٰ کے خلیفہ اور جانشین تھے، اور غوثی کے زمانہ میں زندہ تھے، شیخ محمد ابن حسن غوثی منڈوی (ولادت مانڈو ۹۶۲ھ) نے گلزار ابرار ۱۰۱۴ھ میں لکھنی شروع کی، جو رجب ۱۰۲۲ھ میں اتمام کو پہنچی، اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۰۲۲ھ تک راجہ سید محمد حیات تھے۔

راجہ سید مجتبیٰ بن راجہ سید مبارک آپ راجہ سید مبارک کے دوسرے فرزند ہیں، آپ کا مستقل تذکرہ ذیل میں آئے گا،

---

[1] اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار ص ۳۵۴

البتہ آپ کے فرزند راجہ سید احمد کے تذکرے سے ان کے حالات پر روشنی پڑتی ہے، چنانچہ گنج ارشدی کے حوالہ سے نزہۃ الخواطر میں راجہ سید احمد بن مجتبیٰ مانک پوری کے ذکر میں ہے:

ولد ونشأ بمانكپور، وتفقه على	آپ (راجہ سید احمد) مانک پور میں پیدا ہوئے
والده. وأخذ عنه الطريقة	اور وہیں پروان چڑھے، اپنے والد سے فقہ
ولازمه ملازمة طويلة	اور دین کی تعلیم حاصل کی، نیز ان ہی سے
ثم تصدر للارشاد والتلقين [1]	طریقہ چشتیہ حاصل کرکے مدتوں ان کی صحبت
(نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۶۰)	و خدمت میں رہ کر ارشاد و تلقین کے میدان میں آئے

ان چند جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ راجہ سید مجتبیٰ ابن راجہ سید مبارک کس پایہ کے عالم اور شیخ تھے، اور ان کو علوم ظاہری و باطنی دونوں سے کتنا وافر حصہ ملا تھا۔

راجہ سید احمد بن راجہ سید مجتبیٰ بن راجہ سید مبارکؒ آپ کا تذکرہ گنج ارشدی کے حوالہ سے نزہۃ الخواطر میں اس طرح درج ہے: "احمد بن مجتبیٰ بن مبارک بن احمد بن نور بن حامد حسینی رضوی مانکپوری، آپ احمد حلیم کے نام سے مشہور ہیں، مشائخ چشتیہ میں سے ہیں، مانکپور میں پیدا ہوئے اور اپنے والد سے دینی علوم حاصل کرکے ان ہی سے طریقہ چشتیہ حاصل کیا، اور عرصہ دراز تک ان کی صحبت میں رہ کر ارشاد و تلقین کے میدان میں نکلے، آپ کی کشف و کرامت کے بہت سے واقعات مشہور ہیں، بعض تلامذہ نے اپنی کتاب الخوارق الاحمدیہ میں آپ کی کراماتوں کا ذکر کیا ہے، کبھی کبھی خود بھی اپنی کراماتوں کو بیان کیا کرتے تھے، اپنے خاندان کے شیخ الشیوخ شیخ حسام الدین مانک پوری کی ذریات کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے، ان کے خاندان کے بچے جب تک آپ کے سامنے کھیلتے یا سامنے سے گذرتے آپ ان کے احترام میں برابر کھڑے رہتے، حضرت شیخ دیوان محمد رشید جونپوری متوفی ۱۰۸۳ھ اور دوسرے بہت سے مشائخ نے آپ سے طریقت و مشیخت کی تعلیم حاصل کی، حضرت دیوان محمد رشید نے

ان سے طریقۂ چشتیہ کے ساتھ طریقۂ سہروردیہ بھی حاصل کیا تھا اور ان کے خلیفہ بھی تھے، راجہ سید احمد ۹ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۱۴۰ھ میں مانک پور میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے[1]،

ہمارے خیال میں سادات گردیزیہ مانک پور کی بزم چشتیت کا یہ آخری چراغ تھا جو دیار پورب میں روشن ہوا، اور دیوان محمد رشید اور ان کے مریدین و تلامذہ کے ذریعہ اس کی روشنی بارھویں صدی ہجری تک یہاں نظر آتی رہی۔

چند اور گردیزی مشائخ | آئینۂ اودھ کے مصنف نے راجہ سید مبارک کے پوتے راجہ سید یٰسین ان کے لڑکے راجہ سید عبد الحق اور ان کے لڑکے راجہ سید ابراہیم کے نام لکھکر لکھا ہے کہ یہ سب کے سب کامل و قابل و عامل و صاحب باطن گذرے ہیں، اور ہزارہا لوگ ان کے نور باطن سے فیضیاب ہوئے، نقل ہے کہ راجہ سید ابراہیم کے خدام جنات تھے، ان کے خلف الرشید سید میر میران جی، اور ان کے لڑکے سید ابراہیم ثانی تھے، ان دو پشتوں تک وہ پہلا کمال باطنی جیسا کہ چاہیے تھا، حاصل نہ ہوا، تاہم باپ دادا کی تقلید کی کوشش رہی، اور ان کے پسر سید احمد ثانی بخوف ضبطی معافی تبدیل مذہب کرکے امامیہ ہوگئے، سید احمد کے لڑکے سید غلام شاہ کے تین لڑکے تھے، میر حسن علی موضع بھمن پور میں، میر عزیز علی موضع تتنی پرگنہ کوٹلہ تحصیل کھاگا میں، اور میر مدد علی موضع میران پور پرگنہ دلمو میں، میر حسن علی فی الجملہ سنی تھے، باقی دونوں بھائی شیعہ ہیں، اس کے بعد اس خاندان کے چند اور لوگوں کے نام لکھے جن میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔

شیخ حسام الدین مانکپوری اور انکے صاحبزادے شیخ محمود مانکپوری بلاد پورب میں | سلاطین شرقیہ جونپور میں سلطان ابراہیم شاہ شرقی (۸۰۴ھ تا ۸۴۴ھ) کا دور حکومت ارباب علم و فضل کے لیے بڑا پرکشش تھا، اس کی قدردانی اور نیک نفسی کی وجہ سے جونپور دار العلم بن گیا تھا، اور ملک کے بہت سے ارباب کمال یہاں پہنچ آئے تھے، اسی دور حکومت میں حضرت شیخ حسام الدین بن خواجہ

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۹۰، و [2] آئینہ اودھ ص ۲۸۳،

خضر بن جلال الدین عمری مانک پوری، متوفی ۸۵۳ھ نے بھی یہاں قیام فرمایا، آپ نے اپنے والد سے درسیات پڑھکر مشرق کا سفر کیا، اور حضرت شیخ نور الحق بن علاء الحق چشتی بنگالی پنڈوی متوفی سنہ کی خدمت میں مدتوں رہکر طریقۂ چشتیہ میں کمال حاصل کیا، مرشد نے اپنے اس مرید خلیفہ کو ۸۰۴ھ میں مانک پور جانے کی اجازت دی، اس کے بعد شیخ حسام الدین جونپور چلے آئے، اور یہاں سات سال تک نہایت فقر و فاقہ اور گمنامی کی زندگی بسر کرتے رہے، اس کے بعد وہ حسن قبول حاصل ہوا کہ امراء و سلاطین تک آپ کے نیازمندوں میں داخل ہوگئے اور اہل شہر نے آپ سے فیض اٹھایا، آپ ابراہیم شاہ شرقی، محمود شاہ شرقی اور محمد شاہ شرقی کے زمانے میں تھے، آپ کے بعد آپ کے خلیفہ راجہ سید حامد شاہ مانکپوری نے بھی جونپور میں قیام کرکے شیخ کا فیض جاری رکھا۔

شیخ حسام الدین کے صاحبزادے شیخ محمود بن حسام الدین مانک پوری، متوفی ۹۰۰ھ نے والد کے وصال کے کچھ پہلے یا بعد ۸۵۳ھ میں دیار مشرق کا رخ کیا اور جونپور سے آگے بڑھکر غازیپور کو اپنا مستقر بنایا، شیخ حسام الدین کے علم و فضل کی دھوم سے خطۂ پورب گونج ہی رہا تھا کہ ان کے صاحبزادے کی آمد ہوئی، اس لیے قدر دانوں نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا، اس وقت نصیر خان لوہانی حاکم غازیپور تھا، اس نے سلطان سکندر بن بہلول لودھی سے اجازت لیکر شیخ محمود کو وہاں کا میر عدل بنا دیا۔ آپ اس منصب پر تازندگی رہے، اور ۹۰۰ھ میں غازیپور ہی میں وصال ہوا، آپنے سلاطین جونپور میں محمود شاہ شرقی، محمد شاہ شرقی، اور حسین شاہ شرقی کا زمانہ پایا، اور سلاطین لودھی میں سے بہلول لودی اور سکندر بن بہلول لودی کا دور دیکھا۔

راجہ سید حامد شاہ مانک پوری اور انکے خلفاء بلاد پورب میں

شیخ حسام الدین مانک پوری نے سات سال تک فقر و فاقہ اور گمنامی کی زندگی بسر کرکے جونپور اور خطۂ پورب کو سرزمین چشت بنایا اور ان کے صاحبزادے شیخ محمود مانکپوری میر عدل نے اپنے عدل و انصاف سے روحانیت و دیانت بخشی،

ان ہی ایام میں شیخ حسام الدین کے ۲۰ خلفاء میں سے خلیفۂ اعظم راجہ سید حامد شاہ مانکپوری متوفی سنہ ۹۰۱ھ نے بھی یہاں دینی و روحانیت کی بساط بچھائی، شیخ حسام الدین نے ان کو بڑے تزک و احتشام اور فخر و مباہات کے ساتھ جونپور روانہ فرمایا تھا، اس وقت راجہ سید حامد کا عنفوان شباب تھا، اور جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، جونپور میں آپ ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ دیار پورب میں شیخ حسام الدین اور ان کے صاحبزادے شیخ محمود کو جو مقبولیت ہوئی تھی، وہی راجہ حامد شاہ کو حاصل ہوئی، ہر طبقہ کے لوگ اس جانے پہچانے گھر کے نووارد مہمان کے لیے فرش راہ بن گئے، وہ درسیات کے کوئی بڑے عالم و فاضل نہیں تھے، مگر ان کی روحانیت میں وہ کشش تھی کہ بڑے بڑے فضلائے زمانہ بھی آپ کے حلقۂ ارادت میں آگئے، خزینۃ الاولیا میں ہے:

"ویے از علم ظاہری بقدر مایحتاج کفایت کردہ بود، لیکن دانشمندان دہر و علمائے عصر اسیر حلقۂ ارادت او بودند" (ج ۱ ص ۴۰۹)

آپ نے سلاطین شرقیہ میں ابراہیم شاہ شرقی (غالباً) محمود شاہ شرقی، محمد شاہ شرقی اور حسین شاہ شرقی کا زمانہ، اور سلاطین لودھی میں بہلول شاہ لودی، اور سکندر بن بہلول شاہ لودی کا ابتدائی زمانہ پایا۔ یوں تو راجہ سید حامد مانکپوری کے بہت سے خلفاء تھے، مگر دیار پورب میں جن سے آپ کا سلسلۂ فیض جاری ہوا، اور طریقۂ چشتیہ کو فروغ ملا، وہ پانچ ہیں، (۱) آپ کے صاحبزادے راجہ سید نور (۲) شیخ بہاء الدین جونپوری (۳) مولانا شیخ الہداد جونپوری (۴) شیخ حسن بن طاہر جونپوری (۵) شیخ دانیال بن حسن جونپوری، راجہ سید نور کا مستقل تذکرہ آگے آئے گا، اس لیے یہاں باقی چار خلفاء کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔

(باقی)

پوپ کا وثیقہ اور اس کا تحلیلی جائزہ

از جناب مولوی حبیب صاحب ریحان ندوی استاذ جامعہ اسلامیہ لیبیا

گذشتہ نمبر سے حضرت مسیحؑ کے ساتھ یہود کے معاندانہ رویہ، آپ کی توہین اور آپ کی مصلوبیت تک کی تفصیل معلوم ہو چکی ہوا اور یہ باتیں مسیحی عقائد کے اعتبار سے اتنی روشن ہیں کہ ان کے انکار کی جرأت ناممکن ہے، اسی لیے پوپ اپنے وثیقہ میں کھل کر اس کا اعتراف نہیں کر سکے کہ یہود نے حضرت مسیحؑ کو قتل نہیں کیا بلکہ ان کے الفاظ تقریباً گول ہیں۔

ایک بات اور واضح کر دینا ضروری ہے کہ وثیقہ صرف یہود کے لیے نہیں نکالا گیا ہے، بلکہ اس کا تعلق مسیحیت کے علاوہ دوسرے تمام ادیان سے ہے، مثلاً ہندو مذہب، بودھ مت اور اسلام وغیرہ سے، یہ وثیقہ کیوں نکالا گیا اس کی تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے،

چند اصولی چیزوں کو چھوڑ کر بہت سی چیزوں میں اسلام، یہودی مذہب، بدھ مت اور ہندو دھرم کے مقابلہ میں مسیحیت سے متفق ہے۔ اسی لیے ایک زمانہ میں بعض نصرانیوں نے یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ اسلام نصرانی فرقوں میں سے ایک فرقہ ہے۔

اسلام حضرت عیسیٰؑ کو نبی مرسل مانتا ہے، جبکہ یہود نہیں مانتے۔ مگر اسلام کی اس رواداری کے باوجود مسیحیت کو ہمیشہ اسلام سے بیر رہا، لیکن رفتار زمانہ کے ساتھ صلیبیوں کا انداز بدلا، اور بعض مسیحیوں کو اسلام و مسیحیت کے متحدہ اصول تلاش کرنے کی فکر ہوئی، اس سلسلے میں پوپ پوئس ۱۲ نے مشرق کے تمام کیتھولک کو اسلامی اکثریت کے ساتھ میل ملاپ پیدا کرنے کی دعوت دی تھی اور

۶ کردینال کا ایک بورڈ بنایا جو اسلام کا مطالعہ کرکے پوپ کے سامنے رپورٹ پیش کرے، لیکن شاید بعض خارجی اثرات نے پیوس ۱۲ کو اسلام کے بارہ میں صریح فیصلہ سے روک دیا،

پچھلے سال جب پوپ پال ششم نے اردن کا دورہ کیا تو خیال تھا کہ وہ اسلام کے بارہ میں اپنی رائے کا اظہار کریں گے، خصوصاً جیسا کہ انھوں نے قبرص کے صدر مکاریوس کو قضائے گذرنے کے دوران میں جو تار دیا تھا اس میں حواری برنابا کی تعریف کی تھی جو گرجے کی طرف سے بالکل نئی بات تھی، لیکن یہاں بھی خارجی اثرات سے متاثر ہوکر پوپ نے صرف مسلمانوں کے بارہ میں کوئی وثیقہ نکالنے کے بجائے تمام مذاہب سے متعلق ایک تحریر نکالی جس میں آسمانی و غیر آسمانی ادیان سب کو ایک ساتھ پکارا،

اس کا مقصد تمام مذاہب کو لادینیت اور الحاد (کمیونزم) کے خلاف متحد کرنا تھا،

یہود نے اس وثیقہ اور سیاسی چالوں کے ذریعہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور جس طرح سرمایہ دار مغرب کا پورا بلاک یہودیت کا پاس کرتا ہے، اسی طرح پوپ نے بھی اپنے اس وثیقہ میں یہود کا بڑا پاس کیا ہے، اور حضرت مسیحؑ کے سب سے بڑے دشمنوں اور مسیحیت کے سب سے زیادہ مخالفوں کے ساتھ جس رواداری کا ثبوت دیا ہے، اس کے پس پردہ ضرور کوئی ہاتھ ہے، ایسی رواداری کی مثال صلیب مسیح کے بعد سے آج تک تاریخ مسیحیت میں نہیں ملتی۔

مضمون طویل ہوجانے کے باوجود پوپ کے وثیقہ کا ترجمہ کردینا ضروری ہے، تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ پوپ نے اسلام کی بھی تعریف کی ہے، اور مسیحیوں سے التجا کی ہے کہ وہ یہود کے بارہ میں رائے بدل دیں، بعض اہم جملوں کو خط کشیدہ کردیا گیا ہے، جن پر ہم بعد کو اپنا تبصرہ کریں گے،

وثیقہ کا ترجمہ یہ ہے:-

”وہ قرارداد جو ہندو ازم، بدھ مت، اسلام، یہودیت اور سارے غیر مسیحی مذاہب کے بارے میں

لیں کے پادریوں کے مجمع مسکونی ۲ کے تیسرے اجلاس میں جمعہ کے دن ۲۰ نومبر ۱۹۶۴ء کو
ش کی گئی جس کو مجمع نے ۱۶۵۱ ووٹوں کی اکثریت سے پاس کیا، صرف ۹۹ ووٹ اس کے
لاف آئے، اور ۲۴۲ نے سکوت اختیار کیا، سرکاری طور پر اس کا اعلان اس لیے مؤخر کر دیا گیا
کہ ان تحفظات کی تحقیق کی جائے جو گذر چکے،

۱۔ تمہید، اس زمانہ میں جب کہ جنس بشری کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور مختلف قوموں
کے درمیان تعلقات زیادہ ہوتے جا رہے ہیں، کیتھلک گرجا غیر مسیحی ادیان سے اپنے تعلقات کے
بارے میں گہری بحث کرنا چاہتا ہے، کیونکہ سب کے سب مل کر ایک جماعت بناتے ہیں، اور ان سب
کی اصل ایک ہی ہے، چونکہ اللہ نے ساری بشریت کو ایک زمین میں بسایا تھا، (اعمال ۱۷: ۲۶) اور
اس کا مقصد بھی ایک ہے، اور وہ اللہ ہے جس کی عنایت شاملہ، اور سخاوت کے دلائل اور نجات کے
کے مقاصد تمام بشر کے لیے ہیں (حکمہ ۱۱۸، اعمال ۱۴: ۱۷، رومانیوں ۲: ۶، اول تیموتاوس ۲: ۴)
اس دن تک جب کہ وہ مختارین کو مقدس شہر میں جمع کرے گا، جہاں کہ رب کا مجد روشن ہوگا،
جس کی روشنی میں امتیں چلیں گی، (رویا ۲۱: ۲۳) بیشک لوگ مختلف ادیان سے یہ چاہتے ہیں کہ
وہ بشری زندگی کی گتھیوں کو سلجھائیں، جو کل کی طرح آج بھی ان کو پریشان کیے ہوئے ہیں۔ انسان
کیا ہے؟ ہماری زندگی اور اس کا مقصد کیا ہے؟ اچھائی اور برائی کیا ہے؟ حقیقی سعادت کا کون راستہ
ہے؟ موت کیا ہے اور موت کے بعد قضا و ثواب کیا چیز ہے؟ ہمارے وصف سے ماوراء وہ کونسی
ذات ہے جو ہمارے وجود پر محیط ہے، اور جس کے پاس سے ہم آئے ہیں، اور جس کے پاس ہم کو لوٹ کر
جانا ہے۔

۲۔ ہندو مذہب اور بدھ مت۔ ہم مختلف قدیم قوموں میں اس پوشیدہ قوت کی معرفت کی روشنی
دیکھتے ہیں جو تمام موجودات اور حیات بشریہ کے حوادث میں ساری ہے، یہاں تک کہ انھوں نے

اللہ کی ذات کو بھی جان لیا تھا، جو سب کا باپ ہے۔ اس لیے یہ قدیم مذاہب جن کی ثقافت قدیم اور زبانیں ترقی یافتہ ہیں، ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہندو اسرار الٰہی کو تلاش کرتے اور اس کی تعبیر ہندو میتھالوجی کے وسیع، نہ ختم ہونے والے تصو سے بھی کرتے ہیں اور بلند فلسفیانہ افکار سے بھی، وہ زہد، ترک دنیا، گہرے غور و فکر اور محبت الٰہی کے ذریعے آلام دنیا سے چھٹکارے کی راہ تلاش کرتے ہیں۔

اسی طرح بودھ مذہب کے پیرووں کا عقیدہ ہے کہ یہ نیرنگ دنیا بشریت کی سعادت سے عاجز ہے اس لیے وہ ایسا راستہ سکھاتے ہیں جس کے ذریعے آلام دنیا سے آزادی حاصل کرکے کامل راحت سکون کی زندگی تک پہنچ جائیں، یہ عبادت، اللہ تعالیٰ پر اعتماد، پاکیزگی اور فانی چیزوں سے بے نیاز کا راستہ ہے۔

بہرحال دنیا میں جتنے مذاہب بھی ہیں، وہ مختلف طریقوں سے بشریت کے اس درد علاج کے لیے کوشاں ہیں، اور ان کی تعلیمات میں زندگی کا دستور اور مقدس رسوم ہیں کیتھا ان میں سے کسی بات کو بھی برا نہیں سمجھتا جو ان ادیان میں صحیح اور مقدس مانی جاتی ہیں، اور برابر کی یہ بشارت دیے جاتا ہے جو کہ "راہ حق اور زندگی ہیں"۔ (یوحنا ۱۴ : ۶) اور اللہ نے ان کے سے عالم سے صلح کرلی ہے (کورنتوس ۵ : ۱۹)

اور چونکہ گرجا چھٹکارا کے مختلف طریقوں سے واقف ہے (القدیس ایرفاوس ضد البدع اس لیے وہ پوری رواداری کے ساتھ ان تمام طریقوں کو دیکھتا ہے، جن کے سلوک، زندگی، د اور تعلیمات میں نور حقیقت کی تھوڑی سی چنگاری بھی ہے، جو بشریت کو روشن کرسکے، خواہ ان بہت اختلافات ہی کیوں نہ ہو، اس لیے گرجا اپنے ماننے والوں کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ محبت ا کے ساتھ دوسرے مذاہب کے مومنوں کے ساتھ رہیں کیونکہ یہ مذاہب بھی روحانیت اور اجتماعی و

قدروں کے حامل ہیں۔

۳۔ مسلمان۔ گرجا مسلمانوں کو احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے، جو حی و قیوم و قادر خدا کی عبادت کرتے ہیں، جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، جس نے بشر سے گفتگو کی، وہ خدا جس کے احکام بعض اوقات پُر اسرار ہوتے ہیں لیکن دل سے ان پر خضوع واجب ہے، جس طرح ابراہیم نے اللہ کے لیے خضوع کیا، وہ ابراہیم جس کی طرف مسلمان منسوب ہیں، وہ اگرچہ مسیح کو الٰہ (خدا) نہیں مانتے لیکن ان کی تکریم نبی کی طرح کرتے ہیں، اور ان کی ماں مریم عذرا کا احترام اور ان کی طرف وسیلہ کرتے ہیں، یوم آخرت کا انتظار کرتے ہیں، جس دن اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دے گا، اور نماز روزہ کے ذریعہ اللہ سے تقرب کرتے ہیں، اور اس کی کوشش کرتے ہیں کہ شخصی، عائلی اور اجتماعی زندگی با ادب ہو کر اللہ کے لیے گذار دیں۔

اگرچہ ماضی میں مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان اختلاف اور دشمنی رہی لیکن گرجا کی مجلس فریقین کو ترغیب دیتی ہے کہ ماضی کو بھول کر مستقبل میں پورے اخلاص سے آپس میں مفاہمت اور ساری بشریت کے لیے دونوں ساتھ ساتھ ترقی کریں، اور اس اتحاد و اتفاق کے ذریعہ نیکی اور بھلائی پھیل جائے، اور ساری دنیا میں عدل و انصاف قائم ہو جائے

۴۔ یہودیت۔ مسکونی جو کہ گرجا کے راز سے اچھی طرح واقف ہے، جانتی ہے کہ عہد جدید کی قوم اور ابراہیم کی نسل سے اس کا کیا رابطہ ہے، مسیحی گرجا جانتا ہے کہ اس کے ایمان و انتساب کی جڑیں اس کے آباء ابراہیمؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، موسیٰؑ اور دوسرے انبیاءؑ سے متصل ہیں، اور یہ اعلان کرتا ہے کہ تمام مسیح پر ایمان لانے والے ایمان کے ذریعہ ابنائے ابراہیم ہیں (غلاط ۳: ۷) اور ان کی دعوت خاص کے وہ بھی مخاطب ہیں، اس لیے گرجا یہ نہیں بھول سکتا کہ اس نے عہد عتیق کی وحی کو اس شعب کے ذریعہ تسلیم کیا جس کو اللہ نے اپنی رحمت فائقہ سے چاہا، اور گرجا یہ بھی نہیں بھول سکتا کہ

وہ غذا حاصل کرتا ہے۔ اس خالص زیتون کی جڑ سے جس کی بری شاخوں نے طمع کی (رومانین ۱۱: ۱۷)

کنیسہ حقاً یہ ایمان رکھتا ہے کہ مسیح نے جو ہمارے سلام ہیں، انھوں نے اپنی مصلوبیت کے ذریعے

یہود سے اور دوسری قوموں سے مصالحت کر لی، اور دونوں کو ایک قوم بنا دیا، (افسس ۲: ۱۴)

گرجا یہ بھی جانتا ہے کہ رسول شیبب یہودی میں سے پیدا ہوئے۔ اور وہ گرجا کے اساس

اور ستون تھے، اور اسی طرح مسیح کے تلامذہ جنھوں نے انجیل کو دنیا میں پھیلایا، اور یہود اگرچہ کہ ان کا

بڑا گروہ انجیل کو نہیں مانتا، لیکن وہ جیسا کہ رسول نے کہا اپنے آباء و اجداد کی وجہ سے اب تک اللہ کے

محبوب ہیں، (رومانین ۱۱: ۲۸) کیونکہ اللہ کی بخشش اور اس کی دعوت بلا ندامت کے ہوتی ہے۔

گرجا انبیاء و رسل کے ساتھ رب کے اس دن کے انتظار میں ہے جس دن اللہ تمام قوموں

کو ایک آواز سے بلائیگا، اور وہ اللہ کی خدمت کے لیے متفق ہوں گے (اشعیا ۶۶ : ۲۳،

مزمور ۶۵ : ۴، رومانین ۱۱: ۲۲)

مجلس گرجا جانتی ہے کہ مسیحیوں اور یہودیوں کے درمیان ایک مشترک عظیم میراث ہے، اسلیے وہ چاہتی

ہے کہ یہ دونوں تحریروں، لاہوتی تحقیق اور برادرانہ گفتگو کے ذریعہ آپس میں تعارف اور تعلقات پیدا کریں

اور مجلس ایک دوسرے کی مذمت اور تہمت تراشی کو بری نگاہ سے دیکھتی ہے اور یہودیوں کے ساتھ

دشمنی اور ماضی میں ان پر جو ظلم ہوا اس پر افسوس ظاہر کرتی ہے۔

اس لیے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ عیسائی اپنی تعلیمات کی شرح اور مواعظ میں کوئی ایسی بات نہ

کہیں جس سے مومنین کے دلوں میں یہود کے متعلق بغض و کراہت پیدا ہو۔ اور ان سے یہ کہنا چاہئے

کہ وہ مردود، ملعون اور قتل اللہ کے مجرم ہیں، اس لیے کہ مسیح کو جن آلام سے گذرنا پڑا ہے، ان کا

الزام سارے یہودیوں پر نہ لگانا چاہیے، کم از کم اس وقت کے عوام جانتے ہیں کہ گرجا کا ہمیشہ سے

یہ عقیدہ ہے کہ مسیح نے خوشی اور رضامندی کے ساتھ ان آلام اور موت کے لیے اپنے کو پیش کیا تھا۔

وہ اپنی غیر متناہی محبت سے ساری بشریت کی خطاؤں کا کفارہ ادا کریں، اس لیے گرجا کو چاہیے
لوگوں کے کانوں تک پہنچا دیں کہ صلیب مسیح اللہ کی محبت کی علامت اور تمام نعمتوں کا سرچشمہ ہے۔

۵۔ تفرقہ بالکل نہیں۔ اللہ کا علاقہ انسان کے ساتھ اس حیثیت سے کہ وہ سب کا باپ ہے
انسان کا تعلق اپنے بھائی انسان سے اس طرح مربوط ہے کہ "جس نے اپنے بھائی سے محبت
ں کی اس نے اللہ کو نہیں جانا"۔ (یوحنا ۴ : ۸) (لوقا ۱ : ۲۵)

اس لیے مسیحیت میں کسی ایسے نظریہ اور ایسے طریقے کی گنجائش نہیں ہے، جو انسانوں کے درمیان
یک جنس اور دوسری جنس کے درمیان ان چیزوں میں تفریق کرے جن کا تعلق انسانی شرافت
ر انسانی حقوق سے ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ تمام انسان خصوصاً مسیحی ہر قسم کے تفرقے اور ہر اس ظلم سے باز رہیں
سی انسان پر اس کے رنگ، مرتبہ اور دین کی وجہ سے کیا جاتا ہے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر
س پطرس اور پولس رسول کی تقلید کرتی ہے، اور تمام مسیحی مومنوں کو دعوت دیتی ہے کہ "وہ
م امتوں سے اچھے تعلقات قائم کریں"۔ (پطرس ۲ : ۱۲) اور جس طرح کہ پولس الرسول نے
ہا کہ "تم مسالمت کرو سب لوگوں سے جس قدر ممکن ہو تاکہ تم سچے طور پر اپنے اس باپ کے بیٹے بنو
و آسمانوں پر ہے۔ (رومیوں ۱۲ : ۸، متی ۵ : ۴۴)

یہ وثیقہ کے متن کا ترجمہ ہے۔ آیندہ سطور میں اس پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ پہلی بات تو یہ کہ سرکاری طور پر اس اعلان میں تاخیر کی گئی، اس لیے کہ ۹۹ ووٹ اس کی
مخالفت میں آئے، ۲۴۲ ارکان نے ووٹ نہیں دیا، اس کا سبب اسلام، بودھ مت اور
ہندو مذہب کے بارہ میں وثیقہ میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے اختلاف نہیں تھا، بلکہ صرف یہودیوں کے
رہ میں اختلاف تھا، کیونکہ ان سے نفرت اور دشمنی ہر مسیحی کے دل میں پیوست ہے،

۲۔ کیتھولک گرجا نے قدیم مذاہب کی صرف ان چیزوں کا اعتراف کیا ہے جو اس کے نزدیک بھی مقدس اور سچی ہیں،

۳۔ وثیقہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ مسیح کی بشارت یعنی مسیحی مشنریوں کیلئے تبلیغ کا دروازہ کھل جائے۔

۴۔ مسلمانوں کے لیے وثیقہ نے سب سے اچھے الفاظ استعمال کیے ہیں،

۵۔ مگر مسلمان مسیح کو خدا نہیں مانتے، یہی تو اسلام کا امتیازی وصف ہے، کہ خدا کے سوا کسی کو خدا نہیں مانتے

۶۔ مسلمان مریم کا احترام کرتے ہیں لیکن ان کو وسیلہ نہیں بناتے، پختہ مسلمان تو کسی کا بھی وسیلہ اختیار کرنا شرک خفی سمجھتا ہے، وہ قیامت میں صرف رسول خدا کی شفاعت کا متمنی ہے، دنیا میں خدا سے بلا کسی واسطے اور وسیلے کے مانگتا ہے، ان کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ "تجھی سے مانگتے ہیں اور تیری ہی عبادت کرتے ہیں"، (فاتحہ ۴) "جب میرے بندے میرے متعلق تجھ سے پوچھیں تو میں قریب ہوں، مانگنے والے کی مانگ کو سنتا ہوں، تو مجھی سے صرف مانگو۔" (بقرہ ۱۸۶) مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے تقرب کا سب سے بڑا وسیلہ عمل صالح ہے،

۷۔ مسلمان ابراہیمؑ کی طرف منسوب ہیں جس طرح کہ یہود و نصاریٰ" لیکن نسبت کے اس اشتراک کی بنا پر کوئی متحدہ دین نہیں بن سکتا جب تک ابراہیمؑ والی توحید پر سب متفق نہ ہوں، مسیح کا تو قول ہے کہ ابراہیم جیسے کام کرو تو ابراہیم والے بن سکتے ہو (یوحنا ۸: ۳۹) اسی توحید کی وجہ سے ابراہیم کو امامت دی گئی تھی، اس لیے ابراہیم کی اولاد میں بھی جو شرک میں مبتلا ہوگا اس سے امامت چھین جائے گی، حضرت عیسیٰ کی زبان میں "ملکوت اللہ تم سے لیکر دوسروں کو دیدیا جائے گا" (متی ۲۱: ۴۳-۴۴) اور قرآن کا ارشاد ہے "خدا نے کہا کہ میں تمکو لوگوں کے لیے امام بناؤں گا"، تو ابراہیم نے کہا اور میری اولاد، تو خدا نے کہا کہ میرا عہد ظالم نہیں پا سکتا" (بقرہ ۱۲۴) اس لیے اولاد ابراہیم میں جو حنیف ہو

وہی اس امامت کا مستحق ہوگا" ابراہیم نہ تو یہودی تھے، نہ نصرانی بلکہ اطاعت گزار حنیف تھے" (آل عمران) اس کے قبل کی آیت میں کہا گیا ہے کہ "اے اہل کتاب ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو، اور توراۃ و انجیل تو ان کے بعد آئی (آل عمران) اس لیے دین ابراہیمی میں کسی ایسے متحدہ دین کی گنجائش نہیں ہے جو توحید اور شرک وغیرہ متضاد عقائد سے مرکب ہو۔

۸۔ پوپ صاحب نے اسلام کی تعریف کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب اسلام کے بارے میں پوپ پیلاڈین دوم کے زمانہ کے خیالات اور صلیبی افسانہ نویسوں اور شعراء کی افتراپردازیوں کا دور ختم ہوگیا بقول انگریز مورخ ولز اور فرانسیسی اہل قلم ہنری ڈی کاسٹری یہ ماننا پڑا کہ مسلمان سے بڑھکر موحد قوم دنیا میں نہیں۔

۹۔ یہود کے متعلق پوپ بلکہ ویٹکن کی مجلس مقدس سے کئی چیزیں جواب طلب ہیں، پوپ نے اعتراف کیا ہے کہ مسلمان مسیح کو نہیں مانتے ہیں اور مریم عذرا کی تکریم کرتے ہیں،

۱۔ کیا یہود بھی حضرت مسیح کو نبی سمجھتے ہیں؟ یا نعوذ باللہ انیس الشیاطین (متی ۱۲: ۲۴) یا کفر بولنے والا (متی ۲۶: ۶۵) یا فریبی و دغاباز (متی ۲۷: ۶۳)

۲۔ نیز مریم عذرا کے متعلق ان کی کیا رائے ہے؟ ان پر کیسا بہتان عظیم باندھتے ہیں (نساء) ان دونوں باتوں کو وثیقے میں بالکل گول کردیا گیا ہے۔

۳۔ اگر مسیح نے اپنی مصلوبیت سے یہود سے مصالحت کرلی، تو کیا یہود نے بھی اس مصالحت کو قبول کرلیا۔

۴۔ اور وثیقہ کا یہ جملہ تو حیرت انگیز ہے کہ "اگرچہ ان میں کا بڑا گروہ انجیل کو نہیں مانتا لیکن وہ آباء کی وجہ سے اللہ کے محبوب ہیں۔

جب یہ گروہ انجیل کو نہیں مانتا اور مسیح و مریم کو نہیں مانتا تو اس سے مصالحت کی بنیاد

میا ہو سکتی ہے، اور جو گروہ انبیاء کو نہ مانے، ان کو قتل اور ان کی کتابوں کا انکار کرے وہ مومن کیسے ہو سکتا ہے۔

پھر جب آباء کی خبر کی وجہ سے انکار مسیح اور قتل انبیاء کے باوجود بھی یہود محبوب ہیں تو شریعت میں بھی ان کی اولاد کو اپنے آباء کی وجہ سے ماخوذ ہونا چاہیے، جیسا کہ مسیح نے کہا تھا کہ "ہابیل مقدس کے خون سے زکریا بن برخیاہ تک کا خون اس نسل کی گردن پر ہوگا۔" (لوقا ۱۱: ۵۱) خود یہود کے ...عمار نے بھی کہا ہے کہ "اس کا خون ہم پر اور ہماری اولادوں پر ہوگا۔" (متی ۲۷: ۲۵)

پھر آباء سے کون آباء مراد ہیں، جسدی باپ یا روحانی باپ حضرت مسیح نے ان کے آباء کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، شاید مجمع مقدس کی نظر سے بھی گذرا ہوگا کہ "تم ایک باپ سے ہو جو ابلیس ہے اور تمہارے اس باپ کی شہوات کو تم پورا کرنا چاہتے ہو (یوحنا ۸: ۴۴) اور یہ کہ اگر تم ابراہیم کی اولاد ہوتے تو ابراہیم جیسے عمل کرتے (یوحنا ۸: ۳۸)

اور مسیح کی یہ پیشین گوئی پوری ہو کر رہی کہ

اے سانپو اور اے سانپوں کے بچو تم جہنم کی آگ سے کیونکر بھاگو گے، اس لیے دیکھو میں نبیوں اور داناؤں کو اور فقیہوں کو تمہارے پاس بھیجوں گا تم ان میں سے بعضوں کو قتل کرو گے اور صلیب پر کھینچو گے اور بعضوں کو اپنے عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے، اور شہر بشہر ستاؤ گے تاکہ سب راست بازوں کا خون جو زمین پر بہایا گیا تم پر آئے۔ (متی ۲۳: ۳۳-۳۴-۳۵)

ان بداعمالیوں کے بعد یہود ملکوت الہٰی کے مستحق کہاں باقی رہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت سے مشرق و مغرب سے اٹھیں گے اور ابراہیم و اسحٰق و یعقوب کے ساتھ ملکوت آسمانی میں بیٹھیں گے، لیکن ملکوت کے بیٹے تو وہ خارجی ظلمت میں پھینک دیے جائیں گے، اس وقت رونا ہوگا، اور انسان کی آواز۔" (متی ۸: ۱۱-۱۲)

۱۰۔ قرآن بھی کہتا ہے کہ یہود کا دعویٰ تھا

نحن ابناء اللہ و احباؤہ قل فلم	ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں، آپ
یعذبکم اللہ بذنوبکم بل انتم	کہہ دیجئے کہ پھر اللہ تمھارے گناہوں کی سزا میں
بشر ممن خلق	تم کو کیوں عذاب دیتا ہے بلکہ تم بھی دوسری
(مائدہ)	مخلوقات کی طرح ایک معمولی انسان ہو،

یعنی عذاب اس بات کی علامت ہے کہ خدا کے بیٹے اور محبوب نہیں، اس لیے کہ کوئی شخص اپنے بیٹے کو گناہ اور تاریکی میں نہیں چھوڑتا اور نہ عذاب دیتا ہے، بلکہ تم بھی دوسرے انسانوں کی طرح ایک انسان ہو اور تم پر بھی خدا کے فیصلے اسی طرح نافذ ہوں گے جس طرح دوسرے انسانوں پر نافذ ہوتے ہیں، جب تک تم عہد میثاق پر قائم رہوگے تو خدا کے خاص بندوں میں شمار رہوگا جیسا کہ توراۃ میں ہے:

"اگر تم میرے عہد کی حفاظت کروگے تو خاص ہو جاؤگے" (خروج ۱۹ : ۵)

قرآن بھی کہتا ہے

انی معکم لئن اقمتم الصلوٰۃ	اگر تم نماز قائم کرتے رہے اور زکوٰۃ دیتے
و اٰتیتم الزکوٰۃ و اٰمنتم برسلی	رہے اور میرے رسولوں پر ایمان لائے تو میں
(مائدہ ۱۲)	تمھارے ساتھ ہوں۔

لیکن اگر کفر میں مبتلا ہوئے اور میرے احکام کی تعمیل نہ کی تو گمراہ ہو جاؤگے (ایضاً)

یہود کی عزت ملکوت الٰہی کی بنا پر تھی، جب وہ چھن گیا تو عزت بھی چھن جائے گی اور ملکوت ان لوگوں کی طرف منتقل کر دیا جائے گا جو اس پر عمل کریں گے، حضرت مسیحؑ کا ارشاد ہے۔

"ملکوت الٰہی تم سے چھین کر ایسی امت کو دیا جائے گا جو اس پر عمل کرے گی" (متی ۲۱: ۲۲-۴۳)

ان صریح احکام کے بعد یہودیوں سے کس طرح مصالحت ہو سکتی ہے، اگر مسیحؑ کا قول سچا مانا جائے

یا ان کے نائب پوپ کے حکم پر عمل کیا جائے، جب تک انجیل کا کوئی نسخہ دنیا میں باقی ہے اس وقت تک مسیحی یہودیوں کے عقائد و اعمال کو نہیں بھول سکتے، اور پوپ اور مجمع مقدس کی کوششوں کے باوجود آج بھی حضرت مسیح، آپ کے پیغام اور آپ کے پیروؤں کے بارہ میں یہودیوں کے عقائد وہی ہیں جو پہلے تھے۔

غداری کی وجہ سے قتل مسیح کا جرم ہلکا ہو جانا بھی عجیب و غریب بات ہے، مسیح کا قول ہے کہ " ابن انسان سپرد کیا جائے گا جیسا کہ لکھا ہے لیکن اس شخص کے لیے ہلاکت ہے جس کے ذریعے ابن انسان سپرد کیا جائے" (متی ۲۶ : ۲۴) اسی طرح مسیح کا قول بیلاطس سے جس نے تجھے میرے سپرد کیا اس کے لیے سب سے بڑا خطیہ ہے" (یوحنا ۱۹ : ۱۱) اور بیلاطس کو سپرد یہود کے رئیس الکہنہ نے کیا تھا۔

۷- ماضی میں یہود سے جو عداوت تھی گرجا نے اس پر افسوس ظاہر کیا ہے، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس کی ابتدا خود یہود نے کی، حضرت مسیح اور دوسرے انبیاء کے ساتھ، رسول اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ، اور آخر میں جرمنی کی پہلی جنگ میں یہودیوں نے جرمنوں کے خلاف بغاوت کی اور ان کے ساتھ جرمنوں نے جو کچھ کیا، وہ خود ان کی غداری کا نتیجہ تھا، مگر یہ حیرت ہے کہ اسرائیل عربوں کے ساتھ جو سلوک کر رہا ہے، اس کا اشارہ بھی وثیقہ میں نہیں ہے۔

اس کے بعد وثیقہ میں اتحاد و امن کی جو دعوت دی گئی ہے، اس کا یہ جملہ کہ ان چیزوں میں تفریق نہ ہونی چاہیے جو انسانی حرمت و حقوق سے متعلق ہیں، جہاں تک عقائد و ایمانیات کا تعلق ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ اس میں اختلاف اور خیر و شر باقی رہیں گے، ورنہ کیا انسانی اخوت کے لیے پوپ الحاد و کمیونزم کو قبول کر سکتے ہیں، دوسروں کے ساتھ انصاف، کسی کو عزیز سمجھنا یہ سب الگ چیزیں ہیں، لیکن ان کے حاصل کرنے کے لیے ایمانی قدروں کو بدل دینا دین کے

صحیفوں میں تحریف کرنا، اور دین کے دشمنوں سے دوستی کرنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔

۳۔ البتہ کسی کے ساتھ محض مذہب، قومیت اور نسل کے اختلاف کی بنا پر ظلم و زیادتی نہ ہونی چاہیے اسلام کی بھی یہی تعلیم ہے اور یہ تعلیم اس نے اس وقت دی تھی جب رومن امپائر انسانی جانوں سے ہولی کھیل رہا تھا، اور شاہ ایران مختلف قوموں کو بزور شمشیر مسیحی بنا رہا تھا، اور آپس کے لاہوتی جھگڑوں کی وجہ سے خود مسیحی ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہو رہے تھے، حالانکہ مسیح کی تعلیم یہ تھی کہ "جو تلوار لیتے ہیں وہ تلوار ہی سے ہلاک کیے جاتے ہیں، (متی ۲۶ : ۵۲) اور انسان سے محبت خدا سے محبت کا رابطہ ہے۔ (یوحنا ۴ : ۸)۔ اس وقت اسلام نے رنگ و نسل کا فرق مٹا دیا تھا، اور مصریوں کے رب، اسرائیلیوں کے رب اور بنی اسرائیل کے نبی کی تفریق کو مٹا کر ایک رب العالمین اور رحمۃ للعالمین کی صدا بلند کی تھی،

بہرحال وثیقہ کا لفظ لفظ ظاہر کر رہا ہے کہ یہود کی سرشت اور تاریخ مسیحیوں کے نزدیک کیا ہے، اس لیے اس کو بدلنے کی کوشش کرنا بے سود ہے، البتہ اگر پوپ کی دعوت کو مسیحی حکومتیں تسلیم کریں تو دنیا کا نقشہ بدل جائے اور اس کا سارا فتنہ و فساد ختم ہو جائے۔ صرف ان بیانات ناموں اور فتووں سے ملکوت اعلیٰ کے فیصلوں میں تبدیلی نہیں ہو سکتی، اور نہ اسلامی دنیا میں اس کا کوئی اثر ہو سکتا بلکہ خود مسیحی دنیا بھی اس کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوگی۔

ارض القرآن حصہ دوم

قرآن مجید کے اندر جن قوموں کا ذکر ہے، ان میں سے مدین، اصحاب الایکہ، قوم ایوب، بنو اسمٰعیل اصحاب الرس، اصحاب الحجر، انصار اور قریش کی تاریخ اور عرب کی تجارت، زبان اور مذہب پر تفصیلی مباحث۔

(از مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ) ضخامت ۲۲۳ صفحے
قیمت ۔ ۔

ضمیری اصفہانی یا "خسرو ثانی"

از ڈاکٹر ام ہانی فخر الزماں ایم۔اے، پی ایچ، ڈی، ڈی لٹ، ریڈر شعبہ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

کمال الدین ضمیری دسویں صدی ہجری کے مشہور فارسی گو شعراء میں ہے، چونکہ اس کا باپ اصفہان کے باغ "نقش جہاں" میں باغبان تھا، اس لیے اوائل شاعری میں وہ "باغبان" تخلص کرتا تھا، بعد ازاں شاہ طہماسپ کی ملازمت میں جب اس نے علم رمل میں مہارت حاصل کر لی تو شاہ کے حکم کے بموجب ضمیری تخلص اختیار کیا، ایک مرتبہ جب شرف جہاں قزوینی کو اس سے رقابت پیدا ہوئی تو اول الذکر نے اس کی باغبانی کی طرف اشارہ کیا،

من بہ آن بچۂ باغباں نالم
کز عشق تو خوشہ چیں باشد

جب ضمیری تخلص کرنے لگا تو اس سے ضمیری ہمدانی کا ذکر کیا گیا، جواب دیا مضائقہ نہیں، میں اتنے اچھے اشعار کہوں گا کہ وہ پائمال ہو جائے گا، اور یہ نوبت آئے گی کہ لوگ اس کے اچھے اشعار مجھ سے اور میرے برے اشعار اس سے منسوب کریں گے، ایک روز طہماسپ شاہ کے دربار میں امیر خسرو کا ذکر ہو رہا تھا، شاہ نے ضمیری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "ہمارے یہاں بھی ایک "خسرو نادرہ گو" موجود ہے، اس کے بعد وہ "خسرو ثانی" کے نام سے مشہور ہو گیا،

تقی الدین کاشی کا بیان ہے کہ بعض اساتذہ کے دو دیوان جن کے جواب ضمیری تکمیل کو نہ پہنچا سکا، ملا میرک المتخلص بہ داعی نے تکمیل کیے جو اس کا بیٹا تھا، لیکن تقی اوحدی کا بیان ہے کہ اس نے باپ کے کلام کو ایک حلوائی کے یہاں گرو کر کے اس کی قیمت افیون میں

صرف کردی، نیز یہ کہ ضمیری اصفہانی اور محتشم کاشی میں دوستانہ تعلقات تھے، لیکن اس کی وفات (۹۷۳ھ) پر محتشم نے ہجو آمیز تاریخ وفات کہی اور اصفہان میں ضمیری کے پسماندگان کے پاس تعزیت کے لیے گیا، ایک روز ضیاء الدین کرمانی کے مکان پر ضمیری کی یاد میں ایک مجلس تھی، محتشم بھی وہاں پہنچے، لوگوں نے مذکورہ بالا ہجو کے انتقام میں اس کی انتہائی تذلیل و تحقیر کی اور اس میں امیر روزبہان صبری نے نمایاں حصہ لیا، محتشم برہنہ ہو کر کاشان بھاگ گیا؛

ضمیری کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

ای عہد شکن آنہمہ صحبت بکجا رفت — آں آبستنِ پیمانِ محبت بکجا رفت

خوی کردہ رخ از تشنۂ دیدار چہ پوشی — ما ہیچ نگوئیم مروت بکجا رفت

ولہ

مست بگذشتی و از خلوتیانِ ملکوت — بتماشای تو آشوبِ قیامت برخاست

ولہ

میکشد سرو قدت را امروز — آرزوی کہ بدیدار تو دارم امروز

آنچہ دوشینہ بمن حسرتِ دیدار تو کرد — بدعا آہ! اگر دست برآرم امروز

ولہ

پیشِ نظر چہ آورم وعدۂ لطف یار را — ذوقِ وصال طے کند صد شبِ انتظار را

ولہ

حیرتی دارم بکار خود کہ در پیشِ نظر — نیست رخساری دیگرم نمیدانم چرا؟

(خلاصۃ تراجم خلاصۃ الاشعار و عرفات عاشقین)

ولہ

آنچہ می بینم ہمہ وبیت نیست یا روی دگر — ورنہ میدادم بحورت دل بہ خوی دگر

زان ہمہ خواری کہ آمد بر من از عشقت نماند — پای رفتن زآستانت بر سر کوی دگر

ولہ

دل بکوی یار و من از یار دور افتادہ ام — او بدل نزدیک و من بسیار دور افتادہ ام

ولہ

دلا! چو ما ہمہ مہر و وفائیم — کجا در خاطر آں مہ در آئیم

نشستہ گرد وخواری برخ از عشق — بچشم غیر ازاں کم نمائیم
در وصلش زنم ہر دم ضمیری — کہ تا بر خود بلا را در کشائیم

ولہ

شبہای مہ کہ حرف ز روی تو گوشود — گوہم حدیث روی تو تا صد فروشود

(تحفۂ ساقی)

آذر کا خیال ہے کہ ضمیری نے کمیت شعر کا جو اہتمام کیا وہ اگر کیفیت میں بھی کرتے تو بہتر ہوتا، پھر تحریر کرتے ہیں کہ انھوں نے چھ مثنویاں بنام "ناز و نیاز" و "بہار و خزاں" و "لیلی و مجنوں" و "وامق و عذرا" و "حسنۃ الاخیار" و "اسکندر نامہ" لکھی ہیں، ان کے علاوہ حسب ذیل دواوین غزل لکھے ہیں:

"سفینۂ اقبال" و "صورت حال" و "کنز الاقوال" و "عشق بیزوال" و "صیقل ملال" و "عذر مقال" و "قدس خیال" اور اساتذۂ سلف کے جواب میں:

طیبات و بدائع و خواتیم و غزلیات قدیم شیخ سعدی "ظاہرات" و "صنائع و بدائع الشعر" و "نہایۃ السحر" و "عیون الزوال" دیوان خواجہ حافظ شیرازی کے جواب میں اور "سحر حلال" دیوان آصفی مروی کے جواب میں اور "خجستہ فال" شہیدی قمی کے جواب میں، "لوامع الخیال" ہمایون اسفراینی کے دیوان کے جواب میں "بدایۃ وصال" مرزا شرف قزوینی کے جواب میں و "منتہای کمال" کمال خجندی کے جواب میں و "معشوق لایزال" امیر خسرو کے جواب میں و "حسن مآل" حسن دہلوی کے جواب میں لکھے، اور آخر میں ایک چبھتا ہوا فقرہ یہ بھی لکھ دیا کہ "خدا نخواستہ اس کو معلوم ہے ضمیری کتابیں پڑھنے کی بھی قابلیت نہیں رکھتا تھا چنانچہ تو در کنار"۔ (آتشکدہ ص ۱۷۱)

نتائج الافکار میں تحریر ہے کہ "ضمیری اصفہانی قوت طبع وزود شعر دارد"۔ یہ دیوان

دس ہزار اشعار سے زیادہ کا حامل ہے، علم ریاضی میں استاد البشر میر غیاث الدین منصور کا شاگرد تھا، اور حسب ذیل اشعار اس سے منسوب کیے ہیں:

گرفتم با بجا صبر و تحمل وید از دوست نہادم دست بر دل پا کشیم از سر کوئے
ولہ
زبسکہ حسن غرورش گداخت مرا ز من شناختم او ورا نداو شناخت مرا
ولہ
باندک سوز غیرانہ جام رو کان از ہوس باشد چہ آتش در خس افتد شعلہ او یک نفس باشد
ولہ
کاشکی افزون شود ہر لحظہ استغنای او تا ز سر بیرون کنند اہل ہوس سودای او
ولہ
چو می بینم کسی کز کوی او دلشاد می آید فریبی کاول از وی خوردہ بودم یاد می آید
ولہ
فریاد ازاں لحظہ کہ درد دلم آشوخ پرسد ز من و قوت گفتار نباشد
ولہ
ز خانہ دیر مہ من ازاں برون آید کہ بوالہوس ز درد انتظار برخیزد
گذشتہ بازاں امید و نامہ برون از خانہ پایہ شمگرہ در جانم از ہر قطرہ ای صد آرزو
ولہ
فراموشم زیادش بجنت آتم کو کر بد گوئی کنند کہ آزارش واز من دہد یادش
ولہ
شود از خواب چون بیدار و بیند دی در بہانہ چشم مالیدن کند تا ننگرد سویم

ملا ضمیری اپنے بیٹے داعی کے متعلق کہتے ہیں کہ اس نے دو بار مجھ سے تحسین حاصل کی

۱۰۰ اشعار یہ ہیں:

آمدی، رفت ز دل صبر و قرارم بنشیں بنشیں تا بخود آید دل زارم بنشیں
ولہ
آن فراموش وعدہ ہا قربان شوم کاندر پی بیندم از شرمساری وعدہ دیگر دہد

نسخہ علی گڑھ میں صحیح ہے (جس کی کسی اور ماخذ سے تائید نہیں ہوتی) کہ ملا ضمیری نے ۹۷۳ھ میں اصفہان میں انتقال کیا۔

نفائس المآثر نے اس خاندان کے ایک اور ضمیری کا ذکر بھی کیا ہے جو ملا حیرانی کا لڑکا اور

اور قم کا رہنے والا تھا، تحفۂ ساقی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ضمیری تمی نے امیدی کے اس مصرع پر

ای تو سلطانِ ملکِ زیبائی

شاہ طہماسپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

آہم از بیکسی و تنہائی ۔۔۔ آہ ازین بیکسی و تنہائی

کہ دلالی و افسکشی صدبار ۔۔۔ بہتر از شاعری و ملائی

مقربانِ درگاہ کی تعریف میں کہا:

ہمہ حافظ فلاں ایچی ۔۔۔ ہمہ درویش رمز بغرائی

شاہ طہماسپ نے قتل کا حکم دیا لیکن قاضی جہان کی حکمت عملی سے اس کی جان بچ گئی، اس کے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں:

من بر ادی مردم و مجنون بجائ ای ابر غم ۔۔۔ گریہ بر من کن کہ مجنون نوحہ گر دارد بسی

گر یہ من سوز و سوزم گریہ آرد زدرد ۔۔۔ درد مندم گریہ و سوزم اثر دارد بسی

ولہ

میروی جلوہ کناں بیخبر از اہل نظر ۔۔۔ ردشِ مردمِ این شہر چنین است مگر

(نفائس المآثر)

شعر العجم حصہ اول

ادبیات

غزل

از جناب طالب جے پوری

کچھ زیر لب وہ آج جو فرماکے رہ گئے | اک کیف تھا کہ روح پہ برسا کے رہ گئے
جب بن پڑی نہ چشم تمنا کے روبرو | "کچھ مسکرا کے پھول سے برسا کے رہ گئے"
کچھ شکوۂ سنجِ تلخئ جور و ستم رہے | کچھ چشم التفات سے گھبرا کے رہ گئے
خود ان کی باز پرس ہوئی مجھ سے مدتوں | شکوے زبانِ حال پہ جو آ کے رہ گئے
اپنی نگاہِ شوق سے نادم ہوں کس قدر | ملتے ہی آنکھ آج وہ شرما کے رہ گئے
دعوے بہت تھے محرمئ راز کے جنھیں | کچھ عقدۂ حیات وہ سلجھا کے رہ گئے
ان پر بھی اک نگاہِ کرم اے گدا نواز | دامن جو تیرے سامنے پھیلا کے رہ گئے
طے کر چکے تھے دار و رسن کی جو منزلیں | کچھ دور وہ بھی ساتھ مرے آ کے رہ گئے

طالب وہ میرے باغ تمنا کے پھول تھے
کھلنے بھی جو نہ پائے کہ مرجھا کے رہ گئے

غزل

از جناب سید حرمت الاکرام صاحب

اس جام میں کیفیت مے گلفام غزل ہے | یہ نرگس مخمور ہے یا جام غزل ہے
نکھرا سا کا اجالا ہے کہ تفسیر معانی | پلکوں کی یہ لرزش ہے کہ ابہام غزل ہے

ہر نشترِ پنہاں میں ہے اک کیفِ دل افروز — شاید کہ محبت مری انجامِ غزل ہے
مضرابِ نفس اور یہ سازِ دلِ مجروح — ہر ضرب باندازۂ پیغامِ غزل ہے
نازاں ہے بہت اپنی فغانِ سحری پر — میرا دلِ برباد کہ خوش کامِ غزل ہے
وہ دل میں سمائے تو محبت نے صدا دی — یہ پیکرِ زیبا نہیں، اتمامِ غزل ہے
شانوں پہ یونہی رہنے دو زلفوں کو پریشاں — یہ ایک عجب سلسلۂ دامِ غزل ہے
پچھلا پہر، ڈوبتے تاروں کی یہ جھلمل! — شاعر کے لیے جلوۂ الہامِ غزل ہے

حرمت کو بتاؤ کہ یہ ہے فیصلۂ شوق
ان ہونٹوں کی جنبش نہیں انعامِ غزل ہے

غزل

از جناب قمر سنبھلی

ابھی زمیں پہ عطر بیز کارواں گزر گئے — جدھر جدھر سے وہ گئے جہاں جہاں گزر گئے
وہ ڈگمگا سکے قدم کہیں بھی راہِ شوق میں — ہزاروں سر سے آفتوں کے آسماں گزر گئے
تری حسین منزلیں نہیں ملیں تو کیا ہوا — قدم قدم پہ ہم تو چھوڑتے نشاں گزر گئے
وہی ہے دوریٔ حبیب وہی ہیں دھڑکنیں — خوشا وہ دل جو کامران و شادماں گزر گئے
ہوئے جو ہم رہِ طلب کی مشکلوں سے بےنیاز — وفورِ شوقِ دید میں رواں دواں گزر گئے
نگاہِ دلنشیں سے تم نے دیکھا جب بھی میری سمت — دلِ حزیں سے لاکھوں غم کے کارواں گزر گئے

وہ گردِ کارواں بنے قمر جو خاکسار تھے
جواں جن کے عزم تھے وہ کامراں گزر گئے

مطبوعات جدیدہ

کربل کتھا ۔ از فضل علی فضلی، ترتیب مالک رام صاحب و مختار الدین آرزو صاحب،

صفحات ۳۴۰، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ، قیمت قسم اعلیٰ عہ

ملا حسین واعظ کاشفی متوفی ۹۱۰ھ اپنی تفسیر اور خاص طور پر اپنی دو فارسی کتابوں اخلاق حسینی اور انوار سہیلی کی وجہ سے ایران اور ہندوستان میں مشہور ہیں، انھوں نے شہدائے کربلا کے واقعات پر ایک کتاب روضۃ الشہداء لکھی تھی، جو کئی سو برس تک ایران، ترکی اور ہندوستان میں مقبول تھی، اس کتاب کی مقبولیت کی وجہ سے اس انداز پر کئی اور کتابیں لکھی گئیں، اور مختلف زبانوں میں اس کے خلاصے اور ترجمے بھی کیے گئے، خود ہندوستان میں فارسی اور اردو نظم و نثر میں اس کے کئی خلاصے ہوئے ہیں، انہی خلاصوں میں ایک فارسی خلاصہ وہ تھا جسے فضلی نواب اشرف علی خاں کے گھر میں سنایا کرتے تھے، اس خلاصے کے بارے میں تحقیق نہیں ہوسکی کہ کس نے کیا تھا، بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ خود کاشفی ہی نے اس کا خلاصہ کیا تھا، فضلی نے لکھا ہے کہ اس خلاصہ کی زبان چونکہ فارسی تھی، جو عورتوں اور بچوں کو اتنا متاثر نہیں کرتی تھی، جتنا کہ اپنی زبان متاثر کرتی ہے، اس لیے انھوں نے اردو میں اس کا ترجمہ کر دیا، مقابلے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خلاصہ روضۃ الشہداء کا لفظی ترجمہ نہیں بلکہ آزاد ترجمہ ہے، اس کتاب کا نام بعض تذکرہ نگاروں نے "دہ مجلس" بتایا ہے، مگر کتاب کے مقدمہ میں خود فضلی نے اس کا نام

کربل کتھا لکھا ہے، اس کتاب کی اشاعت سے نہ صرف اردو زبان کی قدیم میٹھی بولی کا ایک اور قیمتی نمونہ سامنے آگیا، بلکہ اس سے اردو نثر میں تصنیفات کے آغاز کی تاریخ کا رشتہ بارھویں صدی کی ابتدا تک پہنچ گیا ہے، اب تک کی تحقیق کے مطابق اردو نثر کی یہ پہلی نہیں تو دوسری کتاب ضرور قرار پاتی ہے، مرتبین نے شروع کتاب میں ۴۰-۵۰ صفحے کا ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے، جو بجائے خود ایک خاصے کی چیز ہے، اس کتاب کی اشاعت پر مرتبین کتاب کے ساتھ ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ بھی قابل صد مبارکباد ہے۔

افریقہ ایک چیلنج: از احمد عبد اللہ المسدوسی، صفحات ۱۳۰، کتابت و طباعت متوسط، ناشر مکتبہ خدام ملت، کراچی قیمت عہ

یوں تو وسطی ایشیا، جنوب مشرقی ایشیا اور افریقہ سبھی ممالک اسلامی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں، مگر خاص طور پر افریقہ وہ واحد براعظم ہے، جسے مسلمانوں کا براعظم کہا جا سکتا ہے، نیز وہی ایک ایسا خطہ ہے جہاں عیسائیت مذہبی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے ناکام ہوئی ہے، حالانکہ ایشیا کے مقابلہ میں وہاں مغرب کی استعماریت اور اس کے سایہ میں عیسائیت کی دعوت و تبلیغ کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ احمد عبد اللہ المسدوسی صاحب جن کو اس موضوع سے خاص دلچسپی ہے، اور جو اس سے پہلے مذاہب عالم وغیرہ متعدد کتابیں لکھ کر اہل علم سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں، اس کتاب میں افریقہ کا سیاسی، مذہبی، تمدنی اور جغرافیائی جائزہ لیکر اس چیلنج کی طرف اشارہ کیا ہے جو مغرب کی طرف سے سیاسی اور مذہبی محاذ سے دیا جا رہا ہے، اسلام کا مستقبل افریقہ میں بہت شاندار ہو سکتا ہے بشرطیکہ مسلمان عزم و احتیاط کے ساتھ اپنی دعوتی و تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھیں، اقوام متحدہ کی ۱/۲ تعداد زیادہ تر افریقہ کے ملکوں سے پوری ہو جاتی ہے، جن میں اکثریت مسلمانوں کی ہے

کتاب تصوف اسلامی نقطۂ نظر سے تاریخی حقائق کی جانچ پڑتال اور اردو زبان میں ایک قیمتی دستاویز ہے۔

انوار نظر۔ از منظر لکھنوی مرتبہ شیخ چندر صاحب، بڑی تقطیع، ضخامت ۱۹۰ صفحات، کتابت و طباعت بہتر، پتہ شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، دہلی، قیمت ۱۲؎

منشی منوجت رائے نظر (م ۱۹۲۳ء)، لکھنؤ کے آخری دور کے ممتاز شاعروں میں تھے، ہندوستان کے متعدد مشہور رسالوں اور اخباروں کے وہ اڈیٹر رہ چکے تھے، زمانہ، آزاد، اودھ پنچ وغیرہ کے صفحات ان کے رشحات قلم سے برسوں لالہ زار بنے رہے ہیں، شعر و ادب میں بھی وہ حصہ لے چکے ہیں۔ نقاد لکھنوی کے نام سے جتنے مضمون نکلتے تھے وہ سب ان کے قلم سے ہوتے تھے، حسرت موہانی مرحوم ان کے بڑے قدر داں تھے، انھوں نے ان کی نظم و نثر کو بہت سراہا ہے، انوار نظر ان کی غزلوں اور کچھ نظموں کا مجموعہ ہے۔ غزلوں میں قدیم و جدید تغزل کا اچھا امتزاج ہوتا ہے، لکھنویت کے عیب سے ان کا کلام بڑی حد تک پاک ہے، روانی، برجستگی اور معنویت سے کم ہی شعر خالی ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں

اے دل ہے مرا یا نقش کف پا ہے — غل ہے کہ ایک آئینہ سر راہ پڑا ہے

حالت یہ عشرت محفل پہ قسم سب ہی ہیں — ایک دفتر کے بنا یہ پڑا ہے

دل مرا عشق سے کتنا ہے لبالب لبریز — جب چھلک جاتے ہیں ...

امید ہے کہ اہل ذوق میں ان کا کلام شوق سے پڑھا جائے گا۔

دیوان فائز۔ مرتبہ ڈاکٹر خواجہ فضل امام صاحب، تقطیع خورد، ضخامت ۱۹۰ صفحات، کتابت و طباعت متوسط، ناشر ادارۂ ادب بہارستان، پٹنہ ۱۹، قیمت عہ

یہ سید شاہ قدیر الحق فائز مرحوم کی فارسی غزلیات کا مجموعہ ہے، فائز ...

ذوق تھا، اور اسی ذوق کی تسکین کی خاطر شاعری کرتے تھے۔ ان کا ایک فارسی دیوان ضائع ہو گیا، یہ دوسرا دیوان ہے، اس میں ان کی غزلوں کی تعداد کچھ زیادہ تو نہیں ہے، مگر اکثر ان میں انتخاب ہیں، فارسی زبان پر ان کو غیر معمولی قدرت ہے، اور کم از کم متوسطین شعرائے فارسی کا رنگ ان کے کلام میں ضرور موجود ہے، انھوں نے حافظ و صائب کی بعض مشہور غزلوں پر غزلیں کہی ہیں اور اس کو نبایا ہے، اس "عہد" میں اس مجموعہ کے زیادہ مقبول ہونے کی توقع تو نہیں ہے، مگر اہل نظر میں ضرور یہ پسند کیا جائے گا۔

آسان بنگلا تعلیم - از مولانا حبیب قیصر ندوی، صفحات ۱۲۰، ٹائپ عمدہ،

پتہ مکتبہ العرفان سی ۲۷ ایوب الیونیو، محمد پور ڈھاکہ ۷

پاکستان کے ایک حصہ کی زبان بنگلا ہے، اسی طرح ہندوستان کی کئی کروڑ کی آبادی یہ زبان بولتی ہے، اردو داں طبقہ بنگلا زبان میں بات چیت تو آسانی سے کر لیتا ہے، مگر لکھنے پڑھنے میں وہ دشواری محسوس کرتا ہے، وحید قیصر صاحب ندوی نے اسی ضرورت کے پیش نظر یہ کتاب لکھی ہے، انھوں نے پوری کوشش کی ہے کہ کم سے کم وقت میں اردو جاننے والے اور خاص طور پر مغربی پاکستان کے لوگ بنگلا زبان سیکھ جائیں، اس لیے کہ اس سے پاکستان کے ایک دوسرے حصہ میں یکجہتی کی فضا پیدا ہونے میں بڑی مدد ملے گی، ایک سرسری مطالعہ سے ان کی یہ کوشش کامیاب نظر آتی ہے۔

سلسلۂ تاریخ ہند

دارالمصنفین کے تین اہم اور مقبول ترین سلسلۂ تصنیفات یعنی سیرۃ النبی، سیر الصحابہ اور تاریخ اسلام کے علاوہ ایک اہم سلسلۂ تاریخ ہند کا بھی ہے جس میں اب تک حسب ذیل کتابیں شائع ہو کر ملک و قوم سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں،

مقدمۂ رقعات عالمگیر، ۲۹۴ صفحے قیمت: [illegible]

مختصر تاریخ ہند ۳۰۸ " " [illegible]

تاریخ سندھ ۴۰۸ " " [illegible]

بزم تیموریہ ۴۷۸ " " [illegible]

بزم مملوکیہ ۳۹۴ " " [illegible]

بزم صوفیہ ۵۳۸ " " [illegible]

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک

۵۲۴ صفحے قیمت: [illegible]

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام

۵۰۰ صفحے قیمت: [illegible]

ہندوستان عربوں کی نظر میں

حصہ اول ۴۰۴ صفحے قیمت: [illegible]

حصہ دوم ۴۰۴ صفحے " [illegible]

گجرات کی تمدنی تاریخ مسلمان حکمرانوں کے عہد میں

ضخامت ۳۳۹ صفحے قیمت: [illegible]

"ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے"

اس میں سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کے عہد کے تہذیب و تمدن کی پوری تصویر آگئی ہے،

۶۵۰ صفحے قیمت: [illegible]

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے

اس میں مختلف اہل قلم و مصنفین کے قلم سے اس عہد کے تمدنی و علمی کارناموں کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

۲۵۴ صفحے قیمت [illegible]

ہندوستان کی کہانی ۸۰۰ صفحے قیمت [illegible]

ہندوستان کے سلاطین علما و مشائخ

کے

تعلقات پر ایک نظر

ہندوستان میں مسلمان فرمانرواؤں کا عہد ۱۳ ویں صدی عیسوی سے شروع ہو کر ۱۹ ویں صدی کے وسط تک ختم ہو جاتا ہے، اس ساڑھے چھ سو برس کی مدت میں مختلف مذاق و طبیعت کے تقریباً ۸۴ بادشاہ ہوئے، اور انھوں نے یہاں داد حکمرانی دی، اور ملک کی تعلیم و ترقی میں حصہ لیا، اور بعض بعض نے تو اپنے حُسنِ طبیعت سے اُس کو رشکِ جناں بنا دیا، لیکن اگر ہم یہ جاننا چاہیں کہ مسلمانوں کے مختلف طبقوں سے ان حکمرانوں کے کیا تعلقات تھے وہ کس طرح ان سے پیش آتے تھے، خصوصاً علما و مشائخ طریقت کی اُن کی نگاہ میں کیا قدر و قیمت تھی، اور وہ خود ان فرمانرواؤں کو کس نظر سے دیکھتے تھے، اور اُن کے متعلق کیا خیالات رکھتے تھے، اور وہ اُن پر کس طرح اثر انداز ہوتے تھے، اور یہ سلاطین کس حد تک اُن کا اثر قبول کرتے تھے اور اسکے نتائج کیا ہوئے تو ہم کو تاریخوں میں مُرتّب طور پر اس قسم کے معلومات نہیں مل سکتے، اس مختصر کتاب میں بڑی دیدہ ریزی سے اسی قسم کے معلومات اکٹھا کئے گئے ہیں اور ہندوستان کے سلاطین اور یہاں کے علما و مشائخ کے باہمی تعلقات کی تفصیل بیان کی گئی ہے جس سے ضمناً اس دور کی مذہبی، ذہنی اور فکری تاریخ بھی نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے، اس موضوع پر اردو میں لکھنے کی یہ پہلی کوشش ہے، اس میں مصنف کو کہاں تک کامیابی ہوئی ہے اس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔

مؤلفہ

سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے

ضخامت: ۲۲۰ صفحے۔ قیمت: للعہ۔ "منیجر"